Punjab Mein Ahem Farsi Rubai Go Shoara:
Ek Tajziati Mutalia

پنجاب میں اہم فارسی رُباعی گوشعراء: ایک تجزیاتی مطالعہ

فیکلٹی آف لینگویجز، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ

میں پیش کیا گیا مقالہ برائے پی ایچ ڈی فارسی

۲۰۲۰

نگران

ڈاکٹر زین العباء

اسٹنٹ پروفیسر نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ

آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز ان اردو پرشین اینڈ عربک (پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ) مالیرکوٹلہ

مقالہ نگار

عابد ابراہیم پرہ

شعبۂ فارسی، اُردو اور عربی پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ (پنجاب)

تلخیص

رباعی لفظ رُبع سے نکلا ہے جس کے معنی ہے چار مصرعے۔ اگرچہ رباعی میں چار ہی مصرعے ہوتے ہیں لیکن قابل تعریف بات یہ ہے کہ اُن چار مصرعے میں ایک مضمون کو بیان کیا جاتا ہے۔ چار مصرعوں والی یہ نظم دوسرے اصناف سے وزن کی بنیاد پر الگ ہوتی ہے۔ رباعی کو اگر لغوی معنی سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رباعی میں وہ چار مصرعے ہوتے ہیں جو اوزان مخصوص میں ہوں۔ اس میں پہلے اور چوتھے مصرعے کا ہم قافیہ ہونا لازم ہے۔ رباعی ترانہ لغت میں ہم کو دوسرا نام مل رہا ہے۔ اس میں چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ یہ بھی رباعی کا حسن مانا جاتا ہے۔ صنف رباعی ادب میں بہت قدیم دور سے موجود ہے ان سالوں سے ہماری زندگی کی ترجمانی کرتی آئی۔ ہماری تہذیب جن منزلوں سے گذری ہے اسی کی سچی اور صحیح تصویریں رباعی میں موجود ہے۔ اس عہد کے دوران ہم نے جو کچھ بھی محسوس کیا ہے جو کچھ بھی سوچا ہے اور جو تصورات قائم کئے ہیں۔ جن نظریات کی تشکیل ہوئی ہے۔ ان سب کی صحیح آئینہ داری رباعی نے کی ہے۔

خطہ پنجاب کے ساتھ اس صنف سخن کو پہلے سے ہی گہرا رشتہ رہا ہے اور تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ پنجاب میں تحریر ہوئی رباعیات کے پس پردہ بہت تاریخی، سیاسی اور اخلاقی واقعات ہیں۔ جن کو ادب شناسوں اور عام لوگوں کے سامنے لانا اہم ہے۔ کیونکہ پنجاب میں صوفیت، عرفان ومعرفت اور انسانی قدریں بہت بلند ہے۔ اس لیے تحقیقی کام کے لیے میں نے ''پنجاب میں اہم رباعی گو شعراء: ایک تجزیاتی مطالعہ'' کو منتخب کیا۔ میں نے اس تحقیقی موضوع کے ذریعے سرزمین پنجاب کی فارسی شاعری کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس موضوع کے ذریعے پنجاب میں رباعی گوئی کی اہمیت وافادیت پر تفصیلی جائز لیا گیا ہے۔ پنجاب کے حوالے سے فارسی شاعری کے آغاز وارتقاء کو مفصل طور پر قلم بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ اس نوعیت کا پہلا موضوع ہے جس میں پنجاب کے حوالے سے فارسی رباعی گوئی کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے ڈاکٹر محمد ایوب خان اور ڈاکٹر طارق کفایت، ڈاکٹر عراق رضا زیدی ، ڈاکٹر زینت اللہ جاوید، ڈاکٹر محمد جمیل ارو دیگر قلم کاروں نے فارسی ادب کے کچھ پہلوؤں کو روشناس کیا ہے۔ تاہم اس موضوع کی طرف مزید توجہ دینا بہت اہم ہے، تا کہ پنجاب کے شعراء کی مختلف ادوار میں تحریر کردہ رباعیات کا منتشر شدہ ذخیرہ ایک ساتھ جمع ہو جائے۔ یہ موضوع بالکل نیا اور منفرد ہے۔ اس موضوع کے ذریعے پنجاب کے فارسی ادب کے خلاء کو پر کرنے کا موقع مل گیا۔ اس بات کو ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ رباعی گوئی کا فن بہت ہی توجہ طلب اور دشوار گزار ہے۔ اس طرح کے فن کو حاصل کرنے کے لئے شاعر کو بہت ذکاوت کے ساتھ ساتھ تعبیر کی صلاحیت، شعور کی پختگی اور فنی بصیرت کی ضرورت ہے۔ رباعی کے مطالبات اور اس کی فنی دقتوں پر عبور حاصل کرنا ہر شخص کے بس میں نہیں ہے۔ اس کو ہاتھ میں لینے کے لئے بڑی جانفشانی، عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان تمام مرحلوں سے گزر کر ہی شاعر کامیاب رباعی گو بن سکتا ہے۔

مقالے کو بے جا طوالت سے بچانے کے لیے ان مباحث سے گریز کیا گیا ہے جن کا مقالے کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ یا پھر جن سے متعلق بہت کچھ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ مگر جن کو پس منظر کے طور پر پیش کرنے کی روایت عام رہی ہے۔ ان کا

اشارتاً ذکر کیا گیا ہے۔البتہ اہم اور ناگزیر موضوعات کو ترک نہیں کیا گیا۔اس طرح موضوعات کی اہمیت اور ترتیب کو سامنے رکھتے ہوئے مقالہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت منقسم ہے۔

باب اول ''پنجاب میں فارسی شاعری کی روایت'' ہے۔کسی خطے یا علاقے کی ادبیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اس خطے کے اہم تاریخی واقعات ،اس کے ماحول رہن سہن وطرز معاشرت نیز لسانی پہلوؤں سے آشنائی مقالے میں مفید ثابت ہوتی ہیں۔اور اس خطے میں تخلیق کیے گئے ادبی شہ پاروں کی بہتر تفہیم میں کافی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔اس لیے باب اول میں ان سب پہلوؤں کو پس منظر کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

مقالہ کا دوسرا باب'' فارسی رباعی اور شعراء پنجاب'' ہے۔اس باب میں رباعی کے ارتقاء وایجاد کے حوالے سے تجزیہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ باب دوم میں رباعی کا تعارف بحیثیتِ نظمی اصناف اور اس کی اہمیت وافادیت پر گفتگو کی گئی ہے۔رباعی کی وجہ تسمیہ اور مختلف نام و دیگر لوازمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ساتھ ہی معتبر نقاد کے اقوال کی بھی نشاندہی کی گئی۔علاوہ ازیں تخلیق کاروں کے رباعی کے بارئے میں تاثرات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں ان شعراءکو شامل کیا گیا ہے جنھوں نے دوسرے صنف میں یا اردو شاعری میں شہرت حاصل کی۔لیکن فارسی رباعیات کا بہت ذخیرہ چھوڑا گیا ہے جس کو قارئین کے سامنے لانا ضروری ہے۔

مقالہ کا تیسرا باب'' فارسی رباعی کی بحریں اور موضوعات'' ہے۔اس باب میں رباعی کا استعمال اور رباعی کے فن تکنیک کے بارئے میں تفصیلی سے جائزہ لیا گیا۔یہ ہمارے مقالے کا نہایت اہم اور مرکزی باب ہے۔اس باب میں رباعی کے موضوعات کے حوالے سے بھی تفصیلی جائزلیا گیا ہے۔

مقالے کا چوتھا باب'' پنجاب کے اہم رباعی گوشعراء'' ہے۔اس باب میں اس طرح کوشش کی گئی کہ مقالے میں زیر بحث آنے والے شعراء کے احوالِ زندگی کو مستند معلومات کی بنیاد پر مرتب کرنے کے علاوہ ان کی رباعیات کے مختلف پہلوں پر سیر حاصل بحث کی گئی،تا کہ ان کا تخلیقی جوہر صحیح طور پر سامنے لایا جاسکے۔اس باب میں اہم رباعی گوشعراء کی رباعیات سے بحث کر کے ان کو یکجا کرنے کے سلسلے میں ہر دور کی ادبی خصوصیات اور ادبی ماحول کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

مقالے کی تکمیل کے پیش نظر باب پنجم (حاصل مطالعہ) کو بھی شامل کیا گیا ہے۔بہر حال توقع ہے کہ پنجاب میں فارسی رباعی گوئی کی ایک مکمل تصویر قارئین ادب کے سامنے پیش کی جاسکے گی اور مقالہ اپنی کلی صورت میں آئندہ کام کرنے والوں کے لیے مفید ثابت ہوسکے گا۔

''پنجاب میں اہم فارسی رباعی گوشعراء:ایک تجزیاتی مطالعہ''

مقالہ نگار

عابد ابراہیم پرہ

نگران

ڈاکٹر زین العباء

باب اول:

پنجاب میں فارسی شاعری کی روایت

فارسی زبان وادب کو پنجاب کے ساتھ خاص ربط رہا ہے یہاں کی علمی وادبی زندگی پر فارسی کے اثرات بہت ہیں گذشتہ چھ، ساڑھے چھ سو برسوں میں اس سرزمین سے فارسی کے ایسے عالم اورادیب اُٹھے جن کا مقام فارسی ادب کی تاریخ میں گھٹایا نہیں جاسکتا. کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ آب وہوا، جغرافیائی خصوصیات کی یکسانیت کے سبب سے اہل ایران پنجاب کو'' گلشنِ ایران'' کے نام سے موسوم کرنے لگے تھے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ سرزمین پنجاب ہمیشہ فراخدل رہی ہے۔ ہر ساعت ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں رہا۔ اس خطہ نے کبھی اپنی تنگی داماں کا احساس نہیں ہونے دیا۔ پنجاب نے پہلے سے ہی بلاکسی مذہب وملت کے مختلف قوموں اور تہذیبوں کی آبیاری کی ہیں۔ اور بہت سی دیسی وبدیسی زبانوں کو اپنے خطہ میں پھیلنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ اگر فارسی اہل ایران کی زبان ہے لیکن پنجاب میں اس زبان کو آب وہوا، قدرتی ماحول اتنا خوشگوار ملا ہے کہ آج بھی پنجاب کی مٹی سے فارسی کی مہک محسوس ہوتی ہے مسعود سعد سلمانؔ سے لیکر علاّمہ اقبال وکرپال سنگھ بیدآرتک نہ جانے کتنے شاعر گزرے ہیں جنہوں نے اپنے قلم وقرطاس سے پنجاب میں فارسی شاعری کی شمع روشن رکھی۔ پنجاب کی فارسی شاعری پر قلم کو جنبش دینے سے پہلے اگر ہم پورے ملک کے فارسی ادب کو خاکے میں لانے کی کوشش کریں گے۔ تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان قدیم عرصے سے ہی فارسی زبان وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ فارسی زبان کی ترویج وترقی ہندوستان میں عہد بہ عہد ہوئی ہے۔ ہندوستان میں اس کا زمانہ تقریباً چھ سو سال رہا ہے۔ اس پورے دور میں مذہب ہو، علم وادب ہو، معاشرت ہو۔ سیاست ہو ہر جگہ فارسی زبان ہی ذریعہ خیال رہی ہے۔ یہ زبان محمود غزنوی کے عہد سے ہندوستان میں رائج ہوئی، اور اس نے ہندوستانی تہذیب وتمدن اور سیاسی وادبی تاریخ کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ آج اس کے باعث فارسی میں لکھے ہوئے لاتعداد فرامین اور دستاویز ادبی میراث میں ملتے ہیں۔ ہندوستان اور فارس کے

تعلقات بہت پرانے ہیں۔جن حکمرانوں کی وجہ سے یہاں فارسی زبان کی ابتداء ہوئی ان میں اسکندر کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔جیسا کہ ڈاکٹر ادریس نے اپنی کتاب میں یوں ذکر کیا ہے۔

''سکندر نے ایران کے راستہ سے گذر کر ہی پنجاب پر حملہ کیا تھا۔ان سب کی گفتگو اور باہمی بول چال کا ذریعہ فارسی تھی''۔ [1]

(سرہند میں فارسی ادب،ص ۲۰)

اس گفتگو اور بول چال سے ان کا میل ملاپ لوگوں کے ساتھ ہوا تھا۔اور یہ زبان ہندوستان خاص کر پنجاب میں شروع ہونی لگی تھی۔پنجاب کی ہمیشہ یہ خاصیت رہی ہے، کہ یہاں آب وہوا بیرونی لوگوں کے لیے مفید رہی تھا۔اس کے نتیجہ میں پنجاب نے بہت سی تہذیبوں اورمختلف رسم ورواج کا رنگ اختیار کیا ہے۔علاوہ ازیں پنجاب نے ہندوستان کے تاریخی،سماجی،ثقافتی،ڈھانچے کوطوروطریقہ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

لہذا فارسی زبان وادب کی تاریخ کے مطالعہ کے دوران برصغیر ہند کی علمی اورتہذیبی کوششوں اوراس کے اہم رول سے انکار یا صرف نظرممکن نہیں۔یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کے نتیجہ میں نہ صرف ایرانی زبان وادبیات کا ایک بالکل جداگانہ،مستقل اورآزاد باب جس کو ہم ہندوستانی فارسی ادبیات کا باب کہہ سکتے ہیں وجود میں آیا ہے بلکہ اس نے تہذیبی سطح پر ایسے لافانی اثرات اورنشانیاں چھوڑی ہیں۔جوایران وہند کی تہذیب کا سرمایہ کہی جاسکتی ہے۔تب سے آج تک فارسی تہذیب رگ وریشہ میں پیوست ہےاور ہماراسماج فارسی کے تجلی سے بہت متاثر ہے۔عام درسیات،علم وفضل،شعروادب میں فارسی کا نمایاں رول رہا۔دوسری علمی وادبی تخلیقات کا وسیلہ ہونے کے علاوہ فارسی زبان کے اثرات اورنقوش بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کی سیاسی وملکی،معاشرتی،مذہبی اورثقافتی تاریخ کے اوراق پر بہت نمایاں طور سے مرتسم نظر آتے ہیں۔غزنوی حکومت سے تیموری حکومت کے اختتام تک تاریخ عالم اورتاریخ ہند

کا کم بیش سرمایہ اسی زبان میں قلمبند ہوا ہے۔فارسی ہی وہ زبان ہے جس نے ہندوستان کی تہذیب اور تمدن کو وسعت دینے کی کافی حد تک کوشش کی ہے۔تاریخ اردو ادب کے مصنف جمیل جالبی نے اشارتاً یوں قلم بند کیا ہے

''مسلمان جب برعظیم پاک و ہند میں داخل ہوئے تو
عربی ،فارسی اور ترکی بولتے آئے۔اور جب ان کا
اقتدار قائم ہوا تو فارسی سرکاری زبان ٹھہری''۲

(تاریخ اردو ادب،جلد۲، ص۲)

جب اس زبان کا فروغ ہونا شروع ہوا تو آہستہ آہستہ ابتدائی دور سے لے کر شاقرین کے عہد تک شعرائے فارسی کے بے شمار دواوین ذخیرہ ہوئے ہیں۔دوسرے قسم کے شعری و ادبی آثار کے علاوہ مختلف موضوعات پر اور مختلف علوم سے متعلق فارسی میں لکھی ہوئی کتابیں اتنی کثرت سے ملتی ہیں کہ انسان کو تعجب ہوتا ہے کہ کس قدر علوم و ادبیات کا ضخیم اور قیمتی سرمایہ ہندوستان میں موجود ہے۔اس بیان کو مسٹری نے اپنے کارنامہ persian litrature میں وسعت کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس ذخیرہ میں مصنف نے بڑی تلاش کے بعد حتی المقدور تمام علمی ذخیروں کے مخطوطات کے بارے میں بیش قیمت اور اہم اطلاعات یکجا کر کے فارسی علم و ادب کو ہمیشہ کے لئے اپنا مرہون منت بنا لیا ہے اس ضمن میں ڈاکٹر محمد اقبال نے بھی اپنی کتاب ''فارسی ادب کے ارتقاء میں پانی پت کا حصہ'' میں اس طرح رقمطراز کیا ہے۔

''فارسی زبان نے ہندوستان پر جو نقوش چھوڑے
ہیں وہ کسی اور زبان کے نہیں ہیں۔دور متوسط میں اس
کی علمی اور ادبی حیثیت قابل ستائش رہی ہے۔اس کی

عظمت رفتہ کی داستان مورخین کی تاریخی تصنیفات اورصوفیاءکرام کےملفوظات میں شعرائے بزرگ کے کلیات اور علمائے عظام کی کتابوں اور رسائل میں محفوظ ہیں''۳

(فارسی ادب کےارتقاء میں پانی پت کا حصہ،ص،۱۷)

ہندوستان میں بہت سارےقلعوں ،محلات شاہی ،مساجد ،خانقاہوں ،مناروں اور دوسری تاریخی عمارتوں پرجا بجا فارسی میں کندہ کیئے ہوئے کتبہ،نقوش اورفقرےاس زبان کی وسیع وعریض فرماں روائی کا بین ثبوت ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد تاریخی وادبی مطالعہ میں یوں رقمطراز ہے۔

'' اگرکوئی شخص نیشنل آرکاٹیوز میں جا کر بچشم خود ملاحظہ کرے تو اس زبان کی وسعت و ہمہ گیری کا اندازہ ہوگا۔سیاسی اثرات کی شکل یہ ہے کہ سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے سارے کار و باری دستاویز اسی زبان میں درج کیئے گیئے ۔سرکاری فرامین اوردوسرے اہم کاغذات فارسی میں لکھے جاتے تھے۔''۴

(تاریخی وادبی مطالعہ۔ص۔۳۵)

اردو زبان کی وسعت اورتاریخی ارتقاء کے لیئےبھی فارسی نے جورول ادا کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔اس کا بین ثبوت خوداردو زبان اوراردو زبان کی زندہ تاریخ ہے۔ ہرکوئی قلم کش اورصاحب زبان وادراک اس تابناک حقیقت سے بخوبی واقف ہے۔اردو کےعلاوہ دیگرزبانوں پرمثلاً پنجابی ،سندھی ،کشمیری ،گجراتی ،مرہٹی ،ہندی ،بنگالی ،تامل وغیرہ کے افکار

اور ادب عالیہ کا اگر نظر بہ غائر مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی کسی نہ کسی شکل میں فارسی کے نفوذ و تاثیر کی کارفرمائی ملے گی۔

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی ترقی وفروغ میں سیاسی اور ملکی حالات کو بڑا دخل رہا۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اشاعت اسلام سے قبل ہندوستان اور ایران کے باہمی تعلقات سیاسی اور خاص طور سے تہذیبی ،لسانی،علمی و ادبی سطح پر بہت استوار تھے۔آریائی نسل کی یگانگت نے ان دونوں ملکوں کو قدیم زمانے سے ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا تھا۔ بہت پہلے ایرانی یا زردشتی تہذیب کی روایات ہمارے ملک میں داخل ہو چکی تھی۔

کچھ قرائین سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے واسط میں عربوں کے حملہ اور فتح ایران کے بعد زرتشتی عقائد کے ماننے والے پارسیوں کی کچھ تعداد نے حملہ کے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے ہندوستان کا رخ کیا۔وہ جنوب مغربی علاقوں یعنی پنجاب سندھ، گجرات کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے۔اور آخر کار وہیں بس گئے۔اس واقعہ کو دلیل کے ساتھ عباس مہرین شوتشری نے بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

''درآن گیرودار برخی ازمردم فارس بہ بکران دیبنان
ہجرت کردند واند کی بہ خسرو ز پرو یز دگرد دوم کہ بہ
چینن بناہندہ ستدہ بود پیوسند وتخمینا ہشتصد تن خود را بہ کا
تیاوا رساندند۔ برخی از راہ دریا بہ ساحل جنوب
مغرب ہند ہجرت کردند''۵؎

(آیینہ ہند،ص ۵،۱۳۵۱ھ)

ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ پنجاب میں فارسی زبان اور علوم کی روایت اور اس کا نقش اولین غزنوی امراء کی علم دوستی، سیاسی مطالعے اور ادب نوازی کا

نتیجہ تھا۔اس حیثیت سے وہ بانی کا درجہ رکھتے ہیں۔تقریباً ۴۱۸ھ میں سلطان محمود کے عہد میں پنجاب غزنی کا حصہ بن گیا اور لاہور کو ہندوستان کے صدر مقام کا رتبہ حاصل ہوا۔اس دور میں غزنی سے سیدھے اعلیٰ عہدہ دار یا نائب مقرر ہوکر آتے رہے۔۴۶۸ھ میں سلطان مسعود نے اپنے شہزادہ مجدود کو لاہور کا نائب السلطنت اور ایاز کو اس کا نگران تعینات کیا۔اس طرح لگاتار دیگر غزنوی شہزادئے منصب پر فائز ہوتے رہے۔فارسی کے اولین معمار انہی کے زمانہ میں نہ صرف زندہ تھے۔بلکہ ان کے خوان کرم کے خوشہ چین بھی تھے۔اس واقعہ کی تصدیق ''فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کے مصنف نے یوں کی ہے۔

''لاہور پر غزنویوں کی حکومت ڈیڑھ سو برس سے زیادہ عرصہ تک رہی۔فارسی زبان کو اس عہد میں بڑی ترقی اور اہمیت نصیب ہوئی۔ ہزاروں خاندان غزنی اور ایران کے دوسرے حصوں سے ترک وطن کر کے یہاں آباد ہو گئے۔ان میں صوفیائے علماء اور شعراء بھی شامل تھے۔ان کی آمد سے یہاں فارسی زبان کا رواج ہوا''۔[۶]

(فاسی ادب کی مختصر ترین تاریخ،ص۔۱۵۲)

اس کے علاوہ تذکرہ لباب الالباب کے مصنف سدیدالدین محمد عوفی نے ان ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کیا ہے جن میں متعدد شاعروں کے اشعار غزنوی حکمرانوں کی مدح میں ہیں۔ اس سلسلہ میں ابوعبداللہ نکتیؔ ،ابوالفرج رونیؔ اور مسعود سعد سلمانؔ کے نام سرفہرست ہیں اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تصوف کے عنوان پر فارسی میں پہلی کتاب کشف المجوب اسی ریاست ہی میں غزنوی کے عہد میں لاہور میں لکھی گئی اس کتاب کے مصنف شیخ ابوالحسن علی بن عثمان الجلالی الہجویری ملقب بہ داتا گنج بخش اگرچہ یہ غزنین میں پیدا ہوئے تھے۔لیکن انہوں نے اپنی زندگی

کا بیشتر حصہ لاہور ہی میں گزارا۔ آپ تقریباً ۴۳۱ھ میں تبلیغی مقصد سے لاہور آئے۔ لاہور میں پہلے سے ہی سید اسماعیل بخاری نے دعوت اسلام دیا تھا۔ غزنویوں کے مسلسل حملوں کی وجہ سے ہندو مسلمانوں سے بہت خوف زدہ ہو چکے تھے۔ ان کے دلوں میں دشمنی کے جذبات پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے ان کو اپنے طرح راغب کرنا مشکل بن چکا۔ لیکن یہاں داتا گنج بخش کے استعداد کا ثبوت ہوتا ہے کہ انھوں نے کٹھن حالات میں اپنا مشن خوبی سے پورا کیا۔ تاریخ کے مطابق داتا گنج بخش کی وفات ۴۶۵ھ سے ۴۸۱ھ کے درمیان ہوئی۔ داتا گنج بخش کی تصوف کے موضوع پر پہلی کتاب اس عہد کی ذخیرہ خیز کتاب مانی جاتی ہے۔ جو ۳۴ ابواب پر مشتمل ہے۔ محمد غزنوی اور دیگر مسلمان فاتحین کے بعد گویا تمدن اسلامی اور فارسی زبان وعلوم کی درآمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور ثقافتی سرگرمیوں کے ذیل میں فارسی زبان میں تصنیف وتالیف کے امکانات اور حالات سازگار ہوئے۔ حتیٰ کہ مدرسے، کتاب خانے اور علمی مرکز کھلنے لگے۔ اور علم وادب کا فروغ وسیع پیمانے پر شروع ہوگیا۔ جب محمود غزنوی کے ورثاء نے بجائے غزنہ لاہور کو اپنا مرکزی مقام بنایا تو علم و ادب کی روایات بھی وہیں منتقل ہوگئیں۔ لاہور کو ''غزنین خورد'' کہنے لگے۔ ۱۱۸۶ء میں آخری غزنوی حکمران خسرو ملک کی شکست کے بعد غوریوں کا اقتدار ان علاقوں میں مسلم ہوگیا۔ غزنویوں کی حکومت کو غوریوں کی بڑھتی ہوئی قوت نے غزنی چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ خسرو شاہ نے تقریباً ۵۵۵ھ میں وفات پائی۔ ان کی تاج پوشی بھی لاہور میں انجام ہوئی۔ شہاب الدین محمد غوری کے ہاتھوں ۵۸۶ھ میں اس کی اسیری کے ساتھ پنجاب سے غزنویوں کے شان وشوکت کا بھی اختتام ہوگیا۔ مرکزی حکومت لاہور سے ملتان اور اُوچ اور پھر بعد میں دہلی منتقل ہوگئی۔

غوری حکمرانوں نے بھی فارسی زبان وادب کی بہت اچھی طرح پرورش کی تھی کیونکہ وہ بھی غزنویوں کی طرح علم شناس اور ادب پرور تھے۔ حسن نظامی نیشاپوری نے اپنی کتاب ''تاج المآثر'' میں

ڈاکٹر یوسف حسین خان کے بیان کو قلم بند کیا ہے۔

''سلطان شہاب الدین محمد غوری نے اجمیر میں متعدد مدرسے قائم کئے تھے۔ جو ہندوستان میں ادبی پارہ کی نوعیت کے پہلے مدرسے تھے''۔ ؎

(تاج الماثر۔ص ۴۹۳)

ادب کے لحاظ سے پنجاب کی سرزمین بہت زرخیز ہے اور مردم خیز بھی ہے۔ حب دل اور خلوص نیت سے تابناک ہے۔ اور عشق و وفا کا گہوارہ بھی۔ یہاں کا کلچر البیلا اور موسم رنگیلا، جس کی مٹی مہر وفا کی خوش بو سے مہکتی ہے۔ جس کے پانچوں دریاؤں کے میٹھے پانی نے عوام کی رگ رگ میں مٹھاس بھر دی ہے۔ یہ وہ پنجاب جس کو کسی وقت سپت سندھو کے نام سے جانا جاتا تھا۔ زمانے کے اُونچ و نیچ نے اس زرخیز زمین کو پانچ دریاؤں میں محدود کر دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس میں اور بھی کانٹ چھانٹ ہوئی۔ ڈاکٹر محمد جمیل نے اپنی کتاب میں مہندر سنگھ رندھاوا کے بیان کو اس طرح رقم کیا ہے۔

''پنجاب دنیا کے ان دیسوں میں ہے جس کو اپنی قدیم تاریخ پر فخر ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ قدیم آریہ تہذیب اور ادب نے یہیں پر جنم لیا ہے، اور یہیں سے فروغ پا کر لوگوں کے لیے رہنمائی کا سبب بنی۔ جس کا مختصر اندازہ ہڑپہ اور روپڑ کی کھدائیوں سے دستیاب اشیاء سے لگایا جا سکتا ہے۔ پنجاب شروع سے ہی ہندوستان کی شان وشوکت کا محافظ رہا ہے۔ بیرونی حملہ آوروں کا بھی ان لوگوں نے ڈٹ کر

مقابلہ کیا۔'' [۸]

(اردو، فارسی اور پنجاب، ص، ۵)

پنجاب کے لوگوں میں محنت کا جذبہ ہمیشہ موجود تھا۔ ہر مصیبت کا انھوں نے قوت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ کیونکہ ان کے سینہ میں جفاکشی کا جذبہ موجود ہے، کسی بھی وقت دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ۔انہوں نے قوت کے ساتھ زندگی گزارنے کا دم ہر وقت دکھایا ہے۔ ڈاروں (drown) کی تحقیق کے مطابق انسان کا ظہور سب سے پہلے افریقہ میں ہوا تھا۔لیکن جدید تحقیق نے اس بات کو واضع کر دیا کہ سب سے پرانا وحشی انسان پنجاب کی سر زمین ''پوٹھوہار'' کا باشندہ تھا۔ ڈاکٹر جمیل نے اپنی کتاب اردو، فارسی اور پنجاب میں یوں ذکر کیا ہے۔

> '' پنجابیوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پہلا بن مانس پنجاب کے علاقہ ''پوٹھوہار'' میں پیدا ہوا۔ پنجاب اور فارسی ادب کا رشتہ ذات، حیات اور کائنات والا رشتہ ہے۔'' [۹]

(اردو، فارسی اور پنجاب، ص، ۵)

یہ حقیقت ہے کہ جب کسی قوم کو اپنی زبان کے لیے قربانی دینی پڑتی ہے۔تو قدرتی طور پر اس قوم کے معاشرتی ،لسانی ،اقتصادی اور تہذیبی رشتے مظبوط ہوتے ہیں۔ فارسی زبان کی یہ بڑی خصوصیت ہے کہ اس کا تعلق ایسے وسیع وعریض خطے سے ہے،جس کی آب وہوا نے یہاں کے باشندگان کو ایسا میٹھا لب ولہجہ عطا کیا ہے۔جس میں خاص آوازوں کے الفاظ موجود ہیں۔ الفاظ کی ادائیگی آب وہوا پر منحصر ہوتی ہے۔جس میں مختلف زبانوں کے الفاظ کا ڈھانچہ ہوتا ہے۔جس طرح پہلے ذکر میں آیا ہے۔ کہ پنجاب پانچ دریاؤں کا سرچشمہ اور مختلف تہذیبوں

کا مرکز رہا ہے۔ یہ چیز ہمارے ذہن میں مختلف تصویریں لے کر آتا ہے۔ اگر سارے ملک کی بات کریں گے تو سامنے آتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب مشترکہ تہذیب ہے۔ جس میں مختلف طبقوں کے تصورات، خیالات شامل ہیں۔ پنجاب کے قومی ومعاشرتی نظام میں بھی وہ رنگ موجود ہے۔ جس کی بدولت سبھی مذہبی فلسفوں کو ایک دھاگے میں پرور کر دیا ہے۔ اس مشترکہ تہذیب، ثقافت کو منظر عام پر لانے کے لیے فارسی شناسوں نے قابلِ تعریف خدمات انجام دی ہیں۔ عرصہ قدیم کی تہذیب اور ثقافت کی تلاش وتعین کا فرض بھی دانشورانِ پنجاب نے بخوبی نبھایا ہے۔ ڈاکٹر طارق کفایت اللہ نے تحقیقی مجلّہ جو نواب شیر محمد خان انسیٹی ٹیوٹ (مالیر کوٹلہ) کے زیرِ اہتمام شائع ہوا ہے، میں اس طرح پنجاب کا ذکر کیا ہے۔

''جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے دہلی سلطنت کے قیام سے پہلے ایک طویل زمانے تک بالخصوص غزنوی عہدِ حکومت کے دوران ہندوستان کے فارسی ادب کی بات ہے اس پورے دور میں مسلم حکومت جن علاقوں پر مشتمل تھی ان میں بیشتر پنجاب ہی کے علاقے تھے۔ یا یوں کہیں کہ باقی ہندوستان کے مقابلے میں فارسی کے تعلق سے ادبی سرگرمیوں کا آغاز دوسو سال پہلے ہی ہو چکا تھا۔''[۱۰]

(مجلّہ تحقیق، ص، ۶۹، ۷۰)

تقسیمِ ہندوستان کے ساتھ ہی پنجاب بھی تقسیم ہو گیا۔ اس کو دو حصوں یعنی مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب سے موسوم کیا جانے لگا۔ مشرقی پنجاب ہندوستان کے زیرِ قبضہ رہا ہے، اور مغربی پنجاب پاکستان کے قبضہ میں رہا۔ بلاشبہ اگر چہ اس تقسیم سے فارسی ادب پر گہرا اثر

پڑا۔لیکن اس جدائی کے باوجود بھی پنجاب کا آپسی رشتہ برقرار رہا ہے۔اس باہمی رشتہ داری کو قائم رکھنے میں فارسی ادب کا ہی اہم رول رہا۔پنجاب کے تہوار ،بیاہ شادیاں،رسم ورواج،ادب اور تہذیب کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ہیر رانجھا،سومنی مہیوال،بالو ماہی،سسی پنوں،مرزا صاحباں اور پورن بھگت جیسی عشقیہ داستانیں پنجابی تہذیب کا حصہ بن کر ماضی کی داستان بیان کرتی ہیں۔پنجاب کے لوک گیت،محاورے ضرب الامثال بولیاں لوک کہانیاں بھی پنجابی تہذیب کی پہچان بن چکی ہیں۔ایک نظر اس بادشاہ (سکندر) پر پڑی جس نے تقریباً پوری دنیا کو اپنے قبضہ میں کرنے کی بے حد کوشش کی۔۳۱۶ق م میں جب یونان سے ہندوستان آئے تو اس کا پہلا قدم پنجاب ہی کی سرزمین پر پڑا تھا،یہیں سے اس نے ہندوستان کے دیگر علاقوں کو قبضے میں کرنے کی جدوجہد کی تھی۔حتیٰ کہ پورس کی جنگ بھی یہیں ہوئی تھی۔

پنجاب کی سرحدیں چین کی سرحدوں سے ملتی ہیں۔چوتھی صدی میں ''کسان'' قبیلے نے پنجاب کے ایک بڑے حصے کو اپنے قبضے میں لیے لیا،بعد ازآں چھٹی صدی عیسوی میں ''ہُن'' آئے۔ساتویں اور آٹھویں صدی میں ''بیچ دھر'' کی حکومت قائم ہوئی۔اس کے بعد محمد بن قاسم نے اپنا قبضہ جمالیا تھا۔۱۰۰۴ء کے قریب محمد غزنوی نے حکومت قائم کر کے جالندھر،ملتان،جہلم اور سندھ کو الگ الگ ضلعوں میں تقسیم کردیا۔اس دور کا ذکر ڈاکٹر محمد ادریس نے اپنی کتاب سرہند میں فارسی ادب میں یوں کیا ہے۔

> ''پہلا فارسی دربار سلطان محمود کی زندگی میں (۴۲۹ھ۔۱۰۰۳ء) میں لاہور میں منعقد ہوا۔اس کے علاوہ بہت سے فوجی اور سول افسراں،دانشوراں آکر لاہور کے گردنواح میں آباد ہوگئے۔اس کے نتیجہ میں عوام فارسی زبان وادب اور طریقہ زندگی سے

آشنا ہوئے:''[11]

(سرہند میں فارسی ادب، ص۲۱)

محمود کا عہد تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ہزاروں خاندان غزنی اور ایران کے دوسرے حصوں سے اپنے وطن کو چھوڑکر یہاں آباد ہوگئے۔ان میں صوفیاء کرام، علماء دین اور شعراء بھی شامل تھے۔اس طرح کی شخصیتیں آنے سے یہاں فارسی زبان کا رواج عام ہوا تھا۔لاہور کے ادب شناسوں اور علم پرور لوگوں نے اس علمی مرکز کو بہت حد تک فروغ دینے کی جدوجہد کی تھی۔

خاندان غلاماں کا عہد: ۵۸۲ھ میں شہاب الدین محمد غوری نے لاہور پر قبضہ کرلیا اور اس نے یہیں سے ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر حملے کئے۶۰۰ھ میں محمد غوری قتل ہوا اور اس کے جانشین محمود بن غیاث الدین نے ہندوستان کے نائب السلطنت قطب الدین ایبک کو یہاں کا بادشاہ تسلیم کیا۔اگرچہ پایہ تخت دہلی منتقل ہو چکا تھا۔لیکن قطب الدین کی تاجپوشی کا جشن لاہور ہی میں منایا گیا۔یہ ہندوستان کا پہلا مسلمان خودمختار بادشاہ اور خاندان غلاماں کا بانی تھا۔اس خاندان کے حکمرانوں میں التتمش (۶۰۷ھ-۶۳۴ھ) رضیہ سلطانیہ (۶۳۴ھ-۶۳۷ھ) سلطان ناصر الدین اور غیاث الدین بلبن۶۶۴ھ-۶۵۸ھ) قابل ذکر ہیں۔اس دور کے بادشاہوں کی ایک خاصیت یہ تھی کہ یہ سبھی نسلاً ترک تھے۔لیکن ان کی پرورش علمی ماحول میں ہوئی تھی جہاں فارسی زبان اور ایرانی ثقافت کا غلبہ تھا۔اس لئے انہیں فارسی زبان اور اس کی اشاعت سے بڑی دلچسپی رہی۔اس خاندان کے بارے میں'' فارسی زبان و ادب: ایک ثقافتی مطالعہ'' کے مصنف ڈاکٹر سمیع الدین احمد نے اس طرح قلم بند کیا۔

''غوریوں کے نائبین سلطنت قطب الدین ایبک اور
ناصر الدین قباچہ نے علماء وفضلا کی تربیت و نوازش

میں نمایاں حصہ لیا'' ۱۲؎

(فارسی زبان وادب: ایک ثقافتی مطالعہ۔ص ۴۱)

اس زمانے میں دہلی پایہ تخت ہونے کے باعث مرکز ادب بنا۔ دہلی کے علاوہ صوبائی، صدر مقام اور وہ شہر جہاں مسلمانوں کی لشکر گاہیں تھیں ۔مثلاً ملتان ،تلنبہ ،اُوچ ،اُجودھن ، سنام ، سیالکوٹ وغیرہ فارسی شعراوادب کے مرکز بن گئے ۔ اُوچ میں نصیرالدین قباچہ کے دربار میں سدیدالدین عوفی اور مولانا منہاج الدین سراج جیسے علماء موجود تھے ۔بلبن کے زمانے میں اس کا بڑا بیٹا شہزادہ محمد ملتان کا صوبیدار تھا۔ اس ادب وعلم شناس شہزادہ کے دربار سے امیر خسرو اور حسن سنجری جیسے شاعر کا تعلق تھا۔ انہوں نے دربار کو بہت رونق افزائی فرمائی ۔تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس شہزادہ نے شیخ سعدیؒ کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی ۔اس کے علاوہ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں تاتاریوں کی غارتگری کی وجہ سے بہت سے علماء و فضلاء یہاں آئے جس کی وجہ سے فارسی زبان وادب کو تازہ خون ملا۔ اس دور میں شعراء نے قصائد اور رباعیات زیادہ لکھے ۔بعض رباعیات کسی نہ کسی تاریخی واقعہ سے متاثر ہوکر کہی گئی ہیں ۔مثلاً یہ رباعی جو بہاءالدین اوشی نے قطب الدین ایبک کی مدح میں کہی ، بدایونی نے اس رباعی کو منتخب التواریخ میں قلم بند کیا ہے۔

''اے بخش لک تو در جہاں آوردہ

کان لا کف تو کار بجسان آوردہ

از رشک کف تو خون گرفتہ دل کان

کان و زلعل بہانہ درمیان آوردہ'' ۱۳؎ (منتخب التواریخ۔ص ۵۵)

غوری خاندان کے سلاطین اپنی علم دوستی اور ادب شناسی میں کچھ کم نہیں تھے۔ علم پروری

کی وجہ سے بہت شعراء دربار میں جمع ہوگئے۔جن میں شمس الدین محمد بلخی ،فضلی ملتانی،ضیاء الدین سنجری،ناصری وغیرہ قابل ذکر ہے۔اس عہد میں عمید سنامی پٹیالہ کے نامور شاعر تھے۔جو ۶۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۵۳ھ میں وفات پائی۔وہ اپنی خدادصلاحیت کی بدولت مشہور ہوئے۔عمید سنامی پنجاب کا وہ پہلا شاعر گزرا جس کے کلام میں منظرنگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔اس ضمن میں اس کے لکھے ہوئے سیف وقلم اور جنگ وشراب کے مناظرے قابل ذکر ہے۔آخری عمر میں تصوف کی طرف رحجان ہوگیا اور نعت خانی میں بہت مشہور ہوگئے۔نمونے کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

چو برداردنگارم چنگ بندوذخمہ برناخن　　　زندناہیدرازخم غیرت برجگرناخن

زرشک چنگ اوناہیدراتب گردآن ساعت　　　کبودش گرددازتاثیرآن تب سربسرناخن

مذکورہ شعراء نے فارسی شعروادب کی ترقی کے لیے زمین ہموار کی اور کاروان فن وسخنوری منزل ارتقائی کی طرف چل پڑا۔اس عہد میں عام طور پر صنف قصیدہ اور رباعی کا چلن زیادہ تھا اور شعراء کے کلام کا بیشتر حصہ مدحیہ شاعری پر مشتمل ہے۔عمید سنامی اور دیگر قلم کاروں کے کلام میں بیشتر یہی رنگ نمایاں ہے۔اس زمانہ میں فارسی زبان وادب کو اتنا اضافہ ہوا۔جتنا تیرہویں صدی عیسوی میں دہلی سلطنت کے قیام کے دوران اور اس کے بعد ہوا۔اس عہد میں مرکزی حکومت نے علم وادب کی ترقی کے لئے بڑے مساعد حالات پیدا کر دیے اور تہذیب وتمدن کی راہیں زیادہ روشن کئے ہیں۔سلطان التمش کے مراسم خسرو اور دارالخلافہ دہلی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے طبقات ناصری کا مصنف منہاج سراج جوزجانی یوں بیان کرتا ہے۔

''واین شہر بکثرت انعامات وشمول کرامات آن پا
دشاہ دیندار قحط الرجال آفاق گشت،وہر کہ از حوادث

بلا دعجم و نکبات کفار مغل بفضل ایزدی خلاص
یافت ۔ ملاذ و ملجاومہرب و مامن حضرت جہاں پناہ آں
بادشاہ ساخت'' ۱۴؎

(طبقات ناصری ۔ص ۲۶۱)

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ پنجاب میں اولیائے کرام اور مشائخ کے عرفانی پیغامات اور سلوک و طریقت کے مسائل جن کی بنیاد دینی خدمت ، خدمت خلق ، انسان دوستی اور خلق عظیم جیسے اسلامی ارکان پر رکھی گئی تھی ۔ فارسی زبان اور ادب ہی کے ذریعے نشر و اشاعت کی منزل تک پہنچے ۔اس کا ثبوت ملحوظ ادب کے علاوہ مکتوبات اور رسائل ہیں جو اس عہد میں اور اس دور کے بعد بھی مرتب کئے گئے ۔مشہور صوفی بزرگ مخدوم الملک حضرت شیخ شرف الدین احمد بن یحی منیریؒ کے مکتوبات مسلک و نظریات تصوف اور توحید و وحدت کے موضوع پر سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔اس ضمن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بیان حسب ذیل ہے ۔

'' در تصانیف عالی است از جملہ تصانیف او مکتوبات مشہور لطیف
ترین نفسیات اوست ، بسیاری از آداب طریقیت و اسرار حقیقیت
در آنجا اندراج یافتہ عام'' ۔ ۱۵؎

(اخبار الا اخبار ۱۰۹)

تاریخ کے مطابق فارسی زبان کا تصوف و عرفان اور شعر و ادب سے گہرا تعلق رہا ہے ۔ ہندوستانی صوفیوں سے اس وسیع المشر بی کی بنا پر کم و بیش ہر فرقہ اور مذہب کے لوگ نہ صرف متاثر تھے ۔ بلکہ تصوف سے متعدد بہ حصہ رہے ۔چشتی اولیائے کرام خصوصی طور پر سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء المعروف بہ سلطان کی بلند نظری ، آزاد خیالی اور وسیع

المشر بی اوران کی بااخلاص محفلوں میں سماع اورموسیقی کارواج بالواسطہر رباعی وغزل گوئی کی مقبولیت اوراس کی ہردلعزیزی کا سبب بنا۔اس علمی ماحول کی وجہ سے شعروشاعری اورتغزل کی جانب میلان عام ہوتا گیا۔بہت سے صوفی بزرگوں نے اشعارواقوال سے شاعری اورعرفان کے حکمت کے خزانے کو چار چاند لگائے تھے۔چشتی سلسلے کے علماء اور بزرگواروں کے بارے خیال عام ہے کہ وہ سبھی نکتہ سنج شاعر تھے۔اخبارالااخبار کے مصنف نے اس طرح واقع درج کیا ہے۔

''حضرت خواجہ قطب الدین بختارکا کی اوشیؒ نکتہ سنج
شاعر تھے۔شیخ جمال الدین بانسوی بابا فریدالدین
گنج شکر کے خلیفہ کے اشعار میں ذہنی وقلبی کیفیات اور
عشق الہیٰ کی جھلکیاں ملتی ہیں'' ۱٦؎

(اخبارالااخبار۔ص،١٦١)

اسی عہد میں بوعلی شاہ قلندر اعلیٰ بزرگ کی حیثیت سے ابھرے۔حضرت بوعلی قلندر پانی پتیؒ کے کلام میں تغزل اورتصوف اورشعریت وتصور وحدت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔عشق شاعری کی روح اورسبب اصلی بتاتے ہوئے وہ کہتے ہیں۔

''گرعشق نبوی بخداکس نرسیدی
حسن ازلی پردہ زرخ برنگشودی
گرساقی اووحدت دومیخانہ نگشادی
دردہریکی عاقل وہشیار نبوی
اے بوعلی این ہردوجہاں پاک بسوزی
آندم کہ برآری زدل سوختہ دوری۔'' ۱۷؎

(فارسی ادب کے ارتقاء میں پانی پت کا حصہ،ص ۱۵۰)

اس عہد کے تہذیبی و علمی ماحول میں جب ہر چار طرف شعروشاعری کی چمک اور علم وفن کا بازار تابناک تھا۔ساتھ ہی تصنیف و تالیف کی سرگرمیاں بھی جاری تھیں ۔اس فروغ سے فارسی ادب کو اور ترقی ملی ۔اس کے علاوہ بزرگان دین ملک کے مختلف حصوں میں اپنی خانقاہوں اور جماعت خانوں میں دین مذہب ،نیکی ،اخلاق حسنہ، ہمدردی ، نیک خصلت ،زہد وتقویٰ اور برادری کا درس دے رہے تھے ۔

فارسی ادب کی بجا خدمت کرنے کے بعد خلجی خاندان زوال پذیر ہونے لگا۔اس کے بعد تغلق خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا ،اس خاندان نے ۱۳۲۰ء سے ۱۴۱۳ء تک حکومت کی ۔اس کے تین عظیم بادشاہ گزرے،جنہوں نے فارسی ادب کے فروغ میں بہت خدمت انجام دی ۔غیاث الدین تغلق،محمد شاہ تغلق اور فیروز شاہ تغلق ایسے حکمراں تھے ۔جن کے عہد حکومت میں فارسی زبان وادب نے خوب ترقی کی ۔محمد بن تغلق خود بہت اچھے شاعر تھے ۔اس کے کلام میں شیرینی اور لطافت موجود ہے۔فہم وادراک کا دلدادہ تھا۔ بڑے بڑے علم وفن کے ماہر اس کا لوہا منواتے تھے۔محمد شاہ تغلق کی علم پروری اور علم نوازی کے سبب اس کے عہد میں بے شمار علماء فضلاء اور باکمال اشخاص عراق ،خراسان ،ترکستان سے پنجاب میں داخل ہوئے تھے ۔محمد شاہ تغلق زیادہ وقت مختلف علوم کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا۔شاعری کے ساتھ والہانہ لگاو رکھتا تھا۔اس بادشاہ کے علمی ذوق وشوق نے ہندوستان میں فارسی زبان کی ترویج وترقی کے بہتر مواقع فراہم کیے۔درجہ ذیل اشعار سے ان کی شاعرانہ قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔

بسیار درین جہاں چمیدیم　　　بسیار نعیم وناز دیدیم

اسپان بلند برنشستیم　　　ترکان گراں بہا خریدیم

کردیم بسی نشاط وآخر　　　چون قامت ماہ نوخمیدیم'' ۱۸؎

(تاریخ فرشتہ، جلد اول، ص،۱۴۴)

محمد بن تغلق کی طرح فیروز شاہ بھی بہت دین دار حکمراں تھا۔اس کا دور دہلی سلطنت کا ایک سہنرا دور کہلاتا ہے۔فروز شاہ نے علماء اور شعراء کی بڑی قدر ومنزلت کی۔ وہ بھی علم پرور انسان تھا اور مطالعہ کے ساتھ اتنا لگاو رکھتا کہ مختلف علوم اور زبان کی کتب کو جمع کر کے خود علم حاصل کرتا اور بعد میں دوسروں تک فراہم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

مختلف حکومتوں کی کامیابیوں کے پیش نظر یہ بات چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح عیاں ہے کہ مختلف فاتحین نے جہاں اپنا قبضہ جمایا، وہاں اپنے علاقے کی زبان اور تہذیب بھی پھیلا دی۔ان ہی بیرونی زبانوں اور تہذیبوں میں فارسی بھی ایک میٹھی زبان اور خاص تہذیب کے ساتھ وابستگی رکھتی ہے۔ جہاں بھی اس زبان کے بولنے والے گئے ۔وہاں انھوں نے اس شیرین و لطافت والی زبان کی بدولت سے عوام پر غلبہ پالیا۔یہی وجہ ہے کہ فارسی زبان نے دوسری زبانوں اور تہذیبوں پر اپنا اثر چھوڑ دیا۔اور دوسرؤں کو کافی حد تک متاثر کیا ہے۔صدیوں تک فارسی سرکاری اور درباری زبان رہی ہے۔یہی پنجاب کے ساتھ بھی ہوا ہے۔فارسی زبان وادب نے اپنے جڑوں کو پنجاب میں بہت گہرا کر دیا۔موجودہ دور میں بھی نظر آرہا ہے کہ پنجابی اور فارسی کی رشتہ داری پر بحث ومباحث ہوتے ہوئے یہ واضع ہوتا ہے کہ پنجابی اور دیگر زبانوں میں بے شمار الفاظ ایسے ہیں جو خالص فارسی زبان کے ہیں۔متواتر استعمال ہونے کی وجہ سے ان الفاظ پر شک ہورہا ہے کہ ان کو پنجابی کے ساتھ کوئی وابستگی ہے یا نہیں۔مثلاً عرض داشت، دارو، تیغ، سروپا، دستار، شلوار، گفتار، گذشتہ، قدیم وغیرہ۔اسی طرح فارسی کے ضرب الامثال اور محاورے بھی اپنے اندر ثقافت کے ترجمان ہیں۔ بہت سارے ضرب الامثال اور محاورئے جو خالص فارسی زبان کے ہیں لیکن لوگوں نے اس کا قالب تبدیل کر کے دوسری زبان میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ بہر حال اس بات پر ہر کوئی متفق ہے کہ

پنجاب اور فارسی کا آپسی رشتہ لازم وملزوم ہے۔ یہ ایک دوسرے کے جان وروح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تک پنجاب رہے گا فارسی کے نقوش قائم ودائم رہیں گئے۔ ہر کوئی اس بات سے خبر دار ہے کہ پنجاب کو فارسی سے الگ کرنا محال سے محال ہے۔جس طرح گلشن کے لیے ایک دروازے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ہندوستان کے فارسی ادب کے ارتقار میں پنجاب نے در کا کام انجام دیا۔ڈاکٹر عراق رضا زیدی نے اس باہمی رشتہ کو یوں بیان کیا ہے۔

''پنجاب بیرونی حملہ آوروں کے لیے دروازے کا
کام کرتا رہا۔آریاؤں سے احمد شاہ ابدالی تک اکثر
اسی راستے سے ہندوستان میں داخل ہوئے ہیں۔''١٩

(اردو فارسی اور پنجاب،١١٣)

مغل حکومت میں فارسی ادب کو بہت فروغ حاصل ہوا۔مغل حکمرانوں کی خاصیت یہ ہے کہ یہ سبھی بادشاہ فارسی ادب سے آشنا تھے۔ظہرالدین بابر نہ صرف سخن فہم تھے۔ بلکہ خود شاعر تھے۔ وہ عربی بھی جانتا تھا،ترکی میں اس کا ایک دیوان تھا۔بابر عروض کے استاد مانے جاتے تھے۔کافی حد تک ان کو علمی شعور تھا رباعیات لکھنے پر قادر تھا،عبدالسلام سندیلوی نے رباعی کے ذریعے ان کا علمی معیار بیان کیا ہے۔

درویشاں را اگر چہ نہ از خویشانیم   لیک از دل وجاں معتقد ایشانیم
دور است مگوئے شاہی از درویشی   شاہیم ولے بندہ درویشانیم

بابر کے دربار میں ممتاز شعراء وفضلاء کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ جو برابر اس کی ہمراہی میں رہتے تھے۔جن میں مشہور ومعروف فضلاء اور شعراء شیخ زین الدین وفائی،مولانا بقائی،مولانا شہاب الدین وغیرہ قابل ذکر ہے۔ بابر کے جانشینوں نے بھی اس کی روایت کو برقرار رکھا، برصغیر میں علم وادب بالخصوص فارسی شاعری کی سرپرستی کی۔اس عہد میں لاہور کے

علاوہ سیالکوٹ، ملتان، گجرات، سرہند اور پانی پت وہ مراکز تھے، جہاں فارسی زبان کے بہت سے شعراء وادیب پیدا ہوئے۔ اسی طرح ہمایوں نے بھی ۹۶۳ھ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی اس شمع فروزان کو بجھنے نہیں دیا اور ادب شناس لوگوں کی شاہانہ انداز سے سرپرستی کی، وہ خود بھی شعر کہنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہ اس سخن فہمی کی واضح دلیل ہے کہ اس کی مادری زبان ترکی ہوتے ہوئے بھی اس نے شعروادب کے لیے فارسی زبان کو پسند کیا۔ ہمایوں کی اس رباعی سے ان کے علمی معیار کا انداز ہوتا ہے۔

انیرو کہ فلک بہ قبضہ قدرت اوست   دادست ترا دو چیز کاں ہر دونکوست

ہم سیرت آنکہ دوست داری کس را   ہم صورت آنکہ کس ترا دارد دوست'' [۲۰]

(اردو رباعیات، ص، ۱۶۸)

ہمایوں فارسی زبان کا ترقی خواہ تھا۔ انہوں نے اپنے حکومت کے دوران فارسی ادبیات کو پھیلنے و پھولنے میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمایوں کے امراء نے بھی فارسی زبان کی ترویج وترقی کے لیے کافی خدمات انجام دیں۔ ادبیات کو فروغ دینے کے لیے وہ حاکم کے دوش بہ دوش رہے تھے۔

اس کے بعد مغل سلاطین میں اکبر کا دور نہ صرف سیاسی حیثیت سے اہم تھا، بلکہ علمی و ادبی حیثیت سے فارسی زبان وادب کی ترویج وترقی کا سنہرا دور تھا۔ لاہور کے علاوہ پورا ملک اکبر کے عہد میں علم وادب کا مرکز بن گیا تھا۔ اس ادبی دور میں فیاضیوں کی شہرت سے ایران کے شہروں سے شاعروں اور سخن فہموں کا ایک بڑا گروہ یہاں داخل ہوگیا۔ مغل دور کے ادبی ترویج وترقی کے بارے میں ڈاکٹر ریاض وڈاکٹر صدیق شبلی یوں رقم طراز ہے۔

''ان حالات میں فارسی کے اکثر خوش قریحہ شاعروں

نے برصغیر کی راہ لی اور بادشاہوں نیز ان کے امراء کی

دادودہش سے مستفید ہوتے رہے۔ ہمایوں کے عہد
میں کم مگر اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں ایرانی
شعراء و ادباء کی ایک بڑی تعداد برصغیر کو سدھاری
ہے۔مقامی باکمالوں کی ان کے عہد میں کمی نہ
تھی۔ہم یہاں کسی ایک طبقہ خیالی کے ہنرمندوں کا
بھی خاطرخواہ ذکر نہ کرسکیں گے۔اس گلستان میں
گلوں کی اس قدر فراوانی ہے۔کہ انتخاب مشکل نظر
آرہاہے۔''۲۱

(فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ،۱۹۵)

اکبرنخستین بادشاہ تھا جس نے پہلی بار اپنے دربار میں ملک الشعراء کا عہدہ مقرر کیا،اور سب سے پہلے غزالی مشہدی کو یہ عہدہ عطا کیا۔اس ادبی دربار میں شعراء کی ایک لمبی قطار موجودتھیں۔جس کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔البتہ اس دربار کے مشہور شعراء فیضی،عرفی،نظیری نیشاپوری وغیرہ کے نام کا ذکر لازم وملزوم ہے۔فیضی نے اپنی مثنوی ''نل دمن'' لاہور ہی میں مکمل کردی،اس کا انتقال بھی لاہور میں ہوا۔فیضی کے علاوہ عرفی کو بھی دربار میں رہنے کا شرف حاصل ہوا،اس کی وفات بھی یہیں ہوئی تھی، اکبر کے نصف صدی دورِحکومت میں وہ نثری اورشعری کارنامے انجام پائے جس کی نظیر پورے عہدوسطی میں نہیں ملتی، جیسے فارسی نثر کے اعلیٰ کام اس دور میں پایہ تکمیل پہنچے تھے،شیخ احمد تہتھوی کی تاریخ الفی،شیخ عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ،نظام الدین احمد کی طبقات اکبری اور ابوالفضل کی آئین اکبری، اکبر کے دور کی یادگار ہے۔علاوہ ازاین اکبر کے حکم سے عالموں نے بہت سی کتابوں کے تراجم بھی کیئے۔ان تراجم میں مہابھارت،راماین،لیلاوتی اور کلیہ دمنہ اکبر کے

دور کی مروجہ فارسی نثر نویسی کے اسلوب کا عمدہ نمونہ ہے۔اس وقت حمید لا ہوری نے ''طوطی نامہ'' کے نام سے ایک مثنوی تحریر کی ،جس کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی تھی ۔ یہ مثنوی سنسکرت سے ترجمہ ہوئی تھی ۔طوطی نامہ میں ستر (۷۰) چھوٹی چھوٹی داستانیں تھیں ۔حمید لا ہوری نے ان میں بتیس (۳۲) کا ترجمہ کیا اوراس مثنوی کی تاریخ درج ذیل ہے ۔

نود وہشت بود ونہصد سال   روزِ آدینہ ہشتم شوال

کہ مرتب شداین فسانہ چند   این حکایت عاشقانہ چند'' ۲۲؎

(اردو فارسی اور پنجاب ،ص ،۱۱۴)

اکبر کا دور فارسی ادبیات کی ترقی کا دور تصور کیا جاتا ہے کیونکہ دربار علمی وادبی ستاروں سے روشن تھا۔اس دور میں پنجاب میں بہت سے عشقی داستانوں نے جنم لیا۔خصوصاً ہیر رانجھا اس وقت کی اہم داستان ہے جس کو پہلے اروڑہ کھتری نے پنجابی میں ترجمہ کیا ۔اور اکبر بادشاہ کا بھی ذکر کیا ہے ۔ پھر وارث شاہ نے اس کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ فارسی ادب میں باقی نامہ کے مصنف نے بھی منظوم ترجمہ کیا ۔ بعد میں شاہ فقیر اللہ آفرین نے ہیر رانجھا کے مشہور قصوؤں کا ترجمہ کیا۔۱۱۴۳ھ میں خود میر غلام علی آزاد نے مثنوی کو لکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ڈاکٹر ادریس نے اس مثنوی کا یہ شعر قلم بند کیا ۔

بعریاں یتیمی تمنا نورد   کہ عید آمد و جامہ گلگونہ کرد'' ۲۳؎

(سرہند میں فارسی ادب ،ص ۱۱۸)

اس کے علاوہ ملا ابوالبرت منیر لاہوری نے ۱۱۵۴ھ میں فارسی ادب کو اپنے کلام سے کافی زینت بخشی تھی ۔انہوں نے فارسی میں سات مثنوعاں قلم بند کی ۔ جو رمزوایما، آب ورنگ ،دردوالم سراج منیر ،نور صفا، ساز و برگ اور رسالہ کارنامہ کے نام سے مشہور ہے ۔ان مثنویوں کے علاوہ منیر لاہوری نے تذکرہ الشعراء ہند اور کارستان بھی تصنیف کی ۔اس نے اورنگ زیب

عالمگیر کے جشن تخت نشینی کے موقعہ پر پرُ جوش استقبال کیا تھا۔اس طرح کے اشخاص سے معلوم ہوتا ہے کی پنجاب وہ صوبہ ہے جس نے مسلم حکومت کی بنا پر فارسی زبان وادب کو بہت تیزی سے گرفت میں لیا۔اوراس صوبہ میں فارسی زبان وادب نے پہلی بار قدم رکھکر تمام ہندستان کو گرویدہ بنالیا تھا۔ یہاں سے جب حکومت اور فارسی زبان کے شاعروں اور ادیبوں نے رخصت لینا شروع کیا۔تو ایک ساتھ شعراء وادباء نے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ یہاں تک کہ مثنوی اور رباعی گو شعراء نے اس دور میں خوب داد تحسین حاصل کی۔ان مثنوعی گو شاعروں میں غلام رکن الدین المعروف بہ شاہ مراد بخش لاہوری قابل ذکر ہے جنھوں نے ۱۲۱۵ھ ۱۲۱۵ء میں مثنوعی ''مرادالعاشقین''،لکھی اور سید فرح بخشی المعروف فرحت لاہوری ۱۲۵۴ء ''مثنوی سسی پنوں''،لکھی ۔رائے کنھیال لاہوری نے ''ظفر نامہ'' لکھا ۔اس کے علاوہ ''نگارین نامہ'' جس کو مصنف نے مولانا رومؔی کی پیروی میں ایک مختصر مثنوی کے طور پر تحریر کیا۔اس مثنوعی کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

''بس لب دمساز خود گر جفتمی ۔۔۔ ھمچو نی من گفتی ھا گفتی

نی کہ نالاں است پیش از چوب نیست ۔۔۔ چوب نالد دل بنالد خوب نیست'' ۲۴

(اردو رباعیات،ص ۱٦۸)

مذکورہ بالا حکمرانوں کی طرح جہانگیر نے بھی اپنے آباواجداد کی ان قابلِ ستائش صفات کو محفوظ رکھا اوراپنے دربار کو فارسی شعراء کا گہوارہ بنادیا۔ جہانگیر نے اپنے دربا کا ملک الشعراء طالب آملی کو بنایا۔ وہ خود بھی ایک اچھا انشاء پرداز تھا۔اس کا علمی شاہکار'' تزک جہانگیری '' ہے۔ جو فارسی ادب میں اپنی سادہ زبان ، بےتکلفی ، بےساختگی اور قادرالکلامی میں بےنظیر ہے۔ جہانگیر کی ایک رباعی آپ کے نظر کرتا ہوں جس سے ان کا علمی معیار معلوم ہوجائے۔

ہرکس بہ ضمیر خود صفا خواہد داد ۔۔۔ آیئنہ خویش را جلا خواہد داد

ہر جا کہ شکستہ بود دستش گیر بشنو کہ ہمیں کاسہ صدا خواہد داد‘‘ ۲۵

(اردو رباعیات،ص،۱۶۸)

عہد جہانگیری کے شعراء میں نور جہاں مخفی،غلام علی حبشی لاہوری،جمال الدین لاہوری،عبدالحق سمندلاہوری،نور محمد انور لاہوری،نواب قاسم خان پنجابی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جہانگیر کے درباری شعراء کے علاوہ اس دور میں ایک اور بڑا شاعر سعداللہ مسیحؔ پانی پتی ابھر کر سامنے آیا۔جس نے اپنے کلام سے فارسی شاعری کو زینت بخشی۔ان کے کلام کا دیوان اگر چہ گم ہوگیا لیکن ان کا شاہکار کارنامہ ترجمہ رامائن ہے۔جو سادہ زبان اور شستگی کے لحاظ سے ادبیات فارسی میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔مسیحؔ پانی پتی کو شیداؔ سے روابط بہت گہرے تھے۔شعر میں اس طرح بیان کرتا ہے۔

درمن و شیداؔ نماند اندرِ حقیقت امتیاز من بشیدا مانم و ماند بمن شیدای من‘‘ ۲۶

(فارسی ادب کے ارتقاء میں پانی پت کا حصہ،ص،۱۵۷)

جس طرح فارسی ادب کا پہلا عظیم ہندوستانی شاعر لاہور میں پیدا ہوا،اسی طرح فاسی ادب کا آخری عظیم شاعر سیالکوٹ میں پیدا ہوکر لاہوری کہلایا۔علامہ اقبال کے ساتھ فارسی کا یہ سفر ختم نہیں ہوتا ہے۔اس کے بعد غلام غوث الصمدنی نے اقبال سے متاثر ہوکر اپنا فارسی کلام لکھا۔مظفر احمد فضلی نے بھی افکارِ اقبال کے خلاف مثنوی رازِ بیخودی تحریر کی ہے۔اس کے علاوہ فضلی نے مثنوی’’لسان العرفان‘‘ اور مثنوی’’واردات دل‘‘ بھی قلم بند کی ہے۔اور بھی بہت سے شعراء میدان ادب میں سامنے آئے،لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کے ساتھ ہی یہ روایت دم توڑ چکی ہے۔بہر حال علم و ادب میں ترویج و ترقی کی برکت سے ہم یہ کہہ سکتے ہے کہ ایرانی دبستانوں شیراز،نیشاپور،بخارا،آزروغیرہ کی طرح پنجاب بھی فارسی زبان وادب کا دبستان بن کر ابھرا۔اس صوبے میں لاہور کو مرکزیت حاصل ہوئی۔جو ہر اصناف کی جزو ہوکر

کلی طور پر نو سو سال تک فارسی زبان و ادب کی خدمت کرتا رہا۔ پنجاب کے ساتھ مسعود سے لیکر اقبال تک ہندستان اور بیروں ملک کے بہت شعراء اور دیگر ادب شناس لوگ وابستہ رہے ہیں ۔مغل دور حکومت کا تاریخ و تذکرہ کا سرمایہ داد و تحسین کے لایق ہے۔اس لحاظ سے یہ دور تمام ادوار سے ممتاز ہے۔ بہت سے تاریخی کتابیں وجود میں آئیں ،مثلاً ہمایوں نامہ کو گلبدن بیگم نے اکبر کی فرمائش پر لکھا ہے۔اس کی دوسری جلد میں برصغیر کے حالات بیان کئے گئے ۔نفائس المآثر میر علاء الدولہ کامی قزوینی کی کتاب ہے۔اس کتاب میں بابر سے اکبر تک کے عہد کے چشم دید واقعات درج کئے گئے ہیں ۔اس کے علاوہ تاریخ رشدی،تاریخ ہمایوں، تاریخ اکبری، تاریخ حقی،تاریخ سندھ، منتخب التواریخ، زبدۃ التوایخ،گلشن ابراہیم، تذکرہ ہمیشہ بہار،خزانہ عامرہ،گوہر عالم،تذکرہ الشعراء کشمیر،حضرات القدس،عرفات العارفین،تذکرۃ الواقعات پادشاہ نامہ،عملِ صالحہ وغیرہ تاریخ و تذکرہ کی حیثیت سے اس دور کا بے بہا اور قیمتی جو ہر موجود ہے۔عہد اکبری کے مشہور شعراء میں آتش لاہوری،شیری لاہوری ،میر احسن بٹالوی،مسیح اللہ لاہوری،مستغنی لاہوری،میر غازی لاہوری،ملا فیضا لاہوری وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔

شاہجہاں نے بھی اپنے جد و اجداد کی طرح فارسی ادب کی بہت خدمت کی تھی ۔اس کے دربار میں بھی شعراء کی تعداد بکثرت موجود رہی ۔جن میں محمد اخلاص سیالکوٹی،علی رضا لی ملتانی،قاضی محمد عارف سیالکوٹی، ملا جامی بیجو دلاہوری،میر حسین عارف لاہوری، دیدہ لاہوری وغیرہ بھی اپنی فیاضی اور قدر دانی میں اکبر اور جہانگیر دونوں سے بازی لے گیا۔اس نے شعراء وفضلا کو بے دریغ انعام واکرام سے نوازا۔اسکی مثال سابقہ عہد میں نہیں ملتی ۔شاہ جہاں کے دور کے خاتمہ کے بعد فارسی ادبیات میں کوئی خاص کارنامے نظر نہیں آرہے ہیں ۔اور خاص کر فارسی شاعری زوال کی طرف مائل ہوگئی ۔اس کا ایک سبب یہ بھی ہے، کہ اورنگ زیب عالمگیر

نے شعراء کی صحیح سرپرستی نہیں کی۔حتیٰ کہ اس نے ملک الشعراء کا عہدہ بھی ختم کردیا۔جس سے ادب شناس لوگوں کے دل تڑپ گئے۔اور ادبی ذوق میں کچھ حد تک کمی واقع ہوئی تھی۔

عالمگیر کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد سیاسی اعتبار سے پورا ملک افراتفری کا شکار ہوگیا۔ان نامساعد حالات میں جہاں حکومت ہی متزلزل ہوا اس وقت ادب و شاعری کی طرف کس کا دھیان ہوتا،آخر کار شاہ عالم ثانی سے بہادر شاہ ظفر تک کے درباروں میں وہ سازگار ماحول قائم نہ رہ سکھی۔جو ان کے اسلاف کے زمانے میں تھی۔اس لیے ان کا دربار ادب شناس وشعر وشاعری کے نغموں سے خالی رہا۔ان کے اجداد کے زمانے میں ایران سے جو بلند پایہ شعراء اور قابلِ قدر فضلاء آئے تھے،ان کی روایات ناپید ہوگئیں۔اور فارسی زبان اپنا اثر کھو بیٹھی۔

انیسویں صدی میں انگریزی حکومت کی ابتداء سے پہلے فارسی زبان کی اہمیت کم ہوگئی تھی۔مغل حکومت کے زوال اور انگریزی حکومت کی ابتداء کے بعد اس صدی کے آخر میں آہستہ آہستہ فارسی زبان نے کاروباری،سرکاری،دفتروں اور علمی مرکزوں میں اپنی جگہ انگریزی زبان کو دے دی۔

مغل عہد کی طرح سکھ حکمرانوں کا عہد بھی فارسی ادب کے لحاظ سے کافی اہمیت کا حامل ہے۔اس عہد میں بھی اہل علم و ادب شناس لوگوں کو کافی حد تک نیک رہنمائی نصیب ہوئی تھی۔خاص کر رنجیت سنگھ کے عہد میں ادب شناس لوگوں کو بہت مرتبہ حاصل ہوا۔یہی وجہ ہے کہ اس دور میں مسلمانوں کے علاوہ بعض اچھے ہندو مصنف بھی پیدا ہوئے،مثلاً منشی سوہن لال مصنف عمدۃ التواریخ،منشی دیارام،کرنل مہان سنگھ اور بخت مل سکھوں کے عہد کا بلند پایہ مصنف تھا۔مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں سرکاری زبان کی ضرورت پڑی لیکن پنجابی کو اتنی فوقیت نہیں تھی کہ اس کو رکھے۔پھر انہوں نے فارسی زبان کو سرکاری زبان اختیار کیا۔مسلمان تو پہلے سے

اس زبان سے واقف تھے۔سکھوں کو بھی سرکاری ملازمتوں کے لیےاور دفتری کاموں کے لیے فارسی سیکھنے کی ضرورت پڑی۔ پھر انہوں نے اس زبان کو سیکھنے کی بے حد کوشش کی تھی۔ اگر چہ اس عہد کے بہت کم قلم کش نظر آتے ہیں۔لیکن فارسی شاعری کا دبہ دبہ بہت دیکھنے کو ملتا ہے۔حتیٰ کہ مال گذاری کا محکمہ ہندوں کے ہاتھوں میں تھا۔جن کی زبان ہندی تھی۔ وہ ہندی زبان کو ہی کافی فوقیت دیتے تھے،لیکن جب راجا توڈرمل نے ہندی کی جگہ فارسی کو ترجیع دی تو پھر ہندؤں نے بھی فارسی کوسیکھنا شروع کردیا۔ڈاکٹر روبینہ شبنم اپنے مقالہ میں یوں رقمطراز ہے۔

''جب راجہ توڈرمل نے ہندی کی جگہ فارسی کو دفتری زبان
بنا کر اس کو حصول ملازمت کے لیےضروری قرار دیا تو
ہندؤں نے فی الفور فارسی پڑھنی شروع کردی۔اور تھوڑی
ہی مدت میں وہ اچھے خاصے ماہر ہوگئے۔'' ۲۷

(دبیر انٹرنیشنل جرنل،ص ۵)

سکھ قوم سے بہت کم ادیب نکلے جنھوں نے قلم کاری کی۔کرنل سنگھ مہان نے کسی حد تک قلم کاری کی طرف اپنی توجہ مبذول کی تھی۔اس قوم نے زیادہ پنجابی زبان کی طرف توجہ دی۔کیونکہ وہ پنجابی کو مذہب کے ساتھ ترجیع دیتے ہیں۔ان کے خیال میں یہ زبان گوروں،فقیروں،صوفیوں کی زبان سمجھتے ہیں۔اس لیے انہوں نے فارسی سے زیادہ پنجابی ہی کو اپنانا شروع کردیا۔ان کی گرنتھ صاحب بھی پنجابی میں لکھی گئی ہیں۔ بہر حال اگر سکھ حکومت کو سامنے رکھیں۔پنجاب میں سکھوں کی حکومت مغلیہ حکومت کے زوال پزیری پر کھڑی کی گئی تھی۔اس لیے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے گذشتہ روایات کو بہت حد تک برقرار رکھنے کی کوشش کی۔مہاراجہ کا دربار دوطبقوں یعنی شعراء وادیبوں کے لیے کافی اہمیت کا حامل تھا۔رنجیت سنگھ خود فارسی شناس تھے،انہیں فارسی کے ساتھ اچھی وابستگی تھی۔اسی لیے وہ دوسروں کے دادرس

تھے۔حکیم عزیزالدین انصاری،فقیرنورالدین ،مصر بیلی رام اس دربار کے خاص رکن تھے۔دیوان گنگارام،دیوان امرناتھ اکبری،دیوان دیناتھ دربار کے اہم علماء کا سرمایہ ہیں ۔ان کے علاوہ روزنامچہ اور تذکرے کو بھی فارسی میں مرتب کیا ہے۔اور اسی زبان میں انگریزوں کے ساتھ خط وکتابت بھی ہوئی تھی۔معاہدے بھی ہوئے تھے۔پنجاب یونیورسٹی کی لائبری میں جو روزنامچے موجود ہے،ان سے معلوم ہوتا ہے،کہ سکھوں نے بہت حدتک مغلوں کی وقائع نویسی کے طریقے کو برقرار رکھا۔سکوں پر بھی انہوں نے فارسی نویسی کو کندہ کرایا۔جسا سنگھ کلال نے اپنے سکوں پر یہ عبارت کندہ کرائی تھی۔

سکہ زد درجہاں بفضل اکال ملک احمد گرفت جسا کلال ''۲۸

(دبیر،ص،٦)

سکھوں کے عہد میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا دربار زیادہ توجہ طلب رہا تھا۔درحقیقت رنجیت سنگھ خود ادب شناس تھے۔وہ اہل علم لوگوں کی بے حد قدر کرتے تھے۔عزیزالدین مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار کا ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر تھااور کافی حدتک درباری رسومات انجام دیتا تھا۔حتیٰ کہ انھوں نے رنجیت سنگھ کے آنکھوں کا علاج بھی کیا تھا۔کیونکہ وہ علم طب میں کافی عبور رکھتا تھا۔اس شاعر بزرگ نے سکھوں اور انگریزوں کے تعلوقات کو بے حد استوار و مستحکم کیا تھا۔ان کے دوستانہ تعلقات کے بارے میں مندرجہ ذیل اشعار بیان کئے ہیں۔

عظیم است احسان واکرام او زبان قاصر آمد ز ارقام او

یکی ہست در علم وفضل وکمال ز اقبال آن نوشی ذوالجلال''۲۹

(دبیر،ص،۷)

قصیدہ گوئی اور رباعی گوئی میں بے حد ماہر تھے۔ایک قصیدے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد کے جانشین ہوئے اور مریدوں کی رہنمائی کرتے رہے۔مثلاً

خلف صدق تو شاہ عزیز الدین　　شد بجائی تو ثانی ای نوشاہ

دستگیری کند مریدان را　　بطفیل تو ثانی ای نوشاہ'' ۳۰؎

(پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ،ص ۸۸)

فقیر نورالدین منور ایک اوراعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔رنجیت سنگھ اس شاعر کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔اس کے دل میں حبِ وطن کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ۔اس کے دیوان میں زیادہ تر مناجات ،نعت،اہل بیتؑ کے معجزات ،مدح غوث الاعظم موجود ہے۔ چنداشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ دل میں کتنا اثر رکھتا ہے۔

کہ ناید ز من ہیچکس را گزند　　زپاو ز دست وزچشم وزبان

اگر ہرعیب کس آگاہ کردی　　ترا گویم ترامی پوش می پوش'' ۳۱؎

(پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ،ص ۸۸)

فقیر نورالدین کی زندگی میں جنگ وجدل کے بہت سے واقعات پیش آئے تھے۔ان عبرتناک واقعات کو دیکھ کر بہت سے شعراء انہیں داستانوں میں قلم بند کیا۔لیکن ان کے کلام میں اپنے ماحول ومحیط کے متعلق تاثیر موجود ہے۔ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر تنہائیوں میں بیٹھ کر اپنی موزوں طبیعت کو حمد ومنقبت میں مصروف رکھتے تھے۔ان کے اشعاروں میں ایک جگہ نظر میں آیا جہاں انہوں نے پنجاب میں امن وامان اور عوام کی خوش حالی کا ذکر کیا ہے۔

صباح الخیراز غیبم نداشد　　صلای عام شد از بہر پنجاب

بہرامن از نیرنگی دھر　　کہ خوش بی غم نماید ھر یکی خواب'' ۳۲؎

(پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ،ص ۱۰)

فقیر امام الدین پچھلے دوشاعروں کا بھائی تھا۔وہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح متواضع ،خوش اخلاق اور کامیاب سفیر تھا۔وہ شعر کو موزوں کر لیتے تھے۔اور اظہر تخلص استعمال کرتے

تھے۔ابھی تک ان کا کلام دستیاب نہیں ہوا۔ایک دن قلندر شاہ لاہوری نے ایک شعر میں انہیں جواب لکھنے کی دعوت دی ہے شعراس طرح ہے۔

باصد شوخی قلندر سرز دار طبعم غزل   از امام الدین اظہر چشم می دارم جواب

یہ ان سینکڑوں ادیبوں اور شاعروں میں سے تین برادراں کا تھوڑا تعارفی ذکر ہے۔جو اس عہد میں شعروادب کی آبیاری کرنے میں معروف تھے۔اسی طرح عرصہ قدیم سے ہی پانی پت کے علم پرور اشخاص نے فارسی ادب کی آبیاری کی ہے۔یہ پنجاب کے خاص شہروں میں ایک ہے جس کو ادبی میدان میں خاص اہمیت حاصل ہیں۔تاریخی،سیاسی اور علمی اعتبار سے ایک اہم ترین مرکز مانا جاتا تھا۔اس اعظیم سرزمین سے بزرگ اور معیار واعلی پایہ کے علماء،صوفیاء،مشائخ،شعراء ،اُدباءاٹھے تھے۔آج بھی انھیں کی جیسی بو آرہی ہے۔بوعلی شاہ قلندر جیسے مجذوب،صوفی شاعر اور الطاف حسین جیسے نامور مفکر وشاعر ابھر کے سامنے آئے تھے۔اس شہر میں عہد کہن کے نقوش،حسین مسجدوں،مندروں اور خانقاہوں کی شکل جابجا کھڑئے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ آج بھی ان سرسبز وشاداب مرغزاروں میں حالؔی کے اشعار کی لہریں ہواؤں کے دوش پر غمزہ ونغمہ کنان ہیں۔پانی پت کی تاریخ کو اگر سامنے رکھا جائے،تو سیدھے ہماری نظر ہندوستان کے بہادر فاتحہ ارجن پر پڑتی ہے جس نے پانی پت کی بنیاد رکھی تھی۔ہر وقت پانی پت اپنی اہمیت کا حامل رہا ہے۔خواہ وہ قدیم عہد ہو یا واسطی عہد ہو۔اس شہر کا ذکر مہا بھارت میں بھی ملتا ہے۔

دروقت وداع سجا را راجہ جدہشتر بہ   گوشہ ای طلبید وپنھان بہ گوش او گفت

کہ آخرین نصائع وخلاصہ کلام این است کہ بہ در جودھن بگو از بدی باز آید و پارہ''۳۳؎

(مہا بھارت،ص۴۷۴)

پانی پت کو میدانی علاقہ نے بہت شہرت دلائی ہیں۔حتیٰ اس میدان نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کیا۔کسی وقت یہ میدان شمال اور مغرب کے درمیان ایک کڑی تھا۔اور یہ میدان پنجاب

کے پانچ دریاؤں کے لیے ایک اہم رابطہ رکھتا ہیں ۔محمد ذکاءاللہ نے اپنی کتاب ’’تاریخ ہند ‘‘میں اس میدان کا یوں ذکر کیا ہے ۔

’’پانی پت کے جس میدان میں لڑائی ہوئی وہ ہموار
زمین کا ایک وسیع قطعہ ہے۔اس میں اونچے ٹیلے
ہونے کے ساتھ ساتھ چھوٹی ندیاں بھی نظر آتی
ہیں ۔یہ میدان ایسا سنسان اور بھیانک ہے کہ
قدرت نے اسی لیے موضوع کیا کہ قومیں اس میں لڑا
کریں ۔‘‘۳۴

(تاریخ ہند،ص۸۳)

پانی پت کو زیادہ شہرت مغل دور میں حاصل ہوئی ۔کیونکہ لودی خاندان کا خاتمہ اور مغل حکومت کا آغاز اسی میدان میں ہوا۔بابر نے بھی اسی میدان میں فاتح حاصل کی ۔اور پایہ تخت کو دہلی بنالیا۔تیس سال کے بعد یعنی ۱۵۵۶ء میں اکبر وہیمو بقال کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی جس نے مغل حکومت کو اور مضبوط کر دیا۔بعد ازآں آخری جنگ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے مابین ۱۷۶۱ء میں ہوئی ۔اس وقت بھی اسی میدان میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا تھا۔آخر دوسری حکومتوں کی طرح مغلیہ حکومت بھی روز بہ روز زوال پذیر ہوتی گئی ۔اور ہندستان بھی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹتا گیا۔اس زوال پذیری کا انگریزوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔پورے ملک پر قابض ہوگئے اور دوسو سال تک حکمرانی کرتے رہے ۔

بہر حال پنجاب کا ایک طاویل تجزیہ لینے کے بعد یہی طے ہوتا ہے کہ طبعی لحاظ سے پنجاب وسطی ایشاء کے خانہ بدوش علاقوں اور گنگا کی سرسبز اور شاداب وزرخیز وادی کے درمیان ایک اہم رابطہ رہا ہے ۔پنجاب کے تاریخی ،سیاسی اور ادبی منظر نامے سے بھی یہی اخذ ہوا ہے

کہ یہ بیرونی حملہ آوروں کے لیے ہمیشہ ایک قدرتی گیٹ وے کی حیثیت سے رہا ہے۔ کیونکہ اس کی زرخیز مٹی، سرسبز میدان، جنت جیسی آب وہوااور پانی کی فراوانی وہ اسباب ہیں جنھوں نے ہمیشہ باہری لوگوں کو اپنی طرف راغب کیا ہے، فارسی میں پنجاب کے ادب کی بات کرتے ہوئے جب اصنافِ ادب کے مختلف گوشوں پر نظر ڈالتے ہیں۔تو جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہی کوئی اصناف ہو، یا ایسا میدان ہو، جس میں پنجاب کی شمولیت نہ ہو۔

پانی پت کی طرح سرہند بھی پنجاب کا اہم شہر ہے۔ یہاں کی علمی وادبی خدمات فارسی ادب کی تاریخ میں نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ سرہند اپنے ابتدائی ایام میں فوجی اور تجارتی سرگرمیوں کا خاص مرکز رہا تھا۔ عہد وسطی میں بالخصوص مغل حکومت میں سرہند کے ادباء ،شعراء ،مورخین اور صوفیاء نے اپنی تخلیقات سے فارسی زبان وادب کے دامن کو وسعت بخشی ۔صوفیاء کی حیثیت سے حضرت مجدد الف ثانی اور ناصر علی سرہندی کے نام عزت سے لیے جاتے ہیں ۔عہد وسطی میں کافی فقہاء ۔مورخین، محدثین، ادباء اور شعراء نے اس چھوٹے سے شہر کو اتنا علمی وادبی ماحول دیا۔ جس کی وجہ سے بادشاہوں نے بھی اس کی طرف توجہ مبذول کر دی ۔اور انہوں نے بہت سے باغات تعمیر کئے تھے ۔اس رونق افزائی کے باعث ہی اب سرہند کو ''خلد برین برزمین'' [۳۵] کا مقام ملا۔

تاریخ شاید ہے کہ سرہند شہر فیروز شاہ تغلق کے عہد میں (۷۶۰تا۷۹۰) میں آباد ہوا تھا۔لیکن اس کی شہرت اکبری عہد میں کمال کو پہونچی تھی ۔عظیم شخصیتیں جیسے طبقات اکبری کے مولف، نظام الدین احمد کے استاد اسد العلماء، مولانا مجد الدین کے استاد شیخ الہداد ین، صالح سرہندی وغیرہ اس سرزمین کے سپوت ہوئے تھے ۔سرہند کے بارے میں محمد قاسم ہندوشاہ نے اپنی کتاب تاریخ فرشتہ میں یوں درج کیا تھا۔

یہ شہر برہمن پادشاہ جے پال کی سلطنت کا حصہ مشرقی حد تھا۔مگر مورخین نے اس

سے بتندہ یا بھٹندہ کے ساتھ ملایا دیا ہے۔اور بعد میں دوبارہ تغلق دور میں آباد ہو گیا۔

زبدۃ المقامات کے مصنف نے سرہند کے دوبارہ آباد ہونے کے بارے میں یوں لکھا ہے۔

''سرہند دراصل سہرند تھا جس کے معنیٰ شیروں کا جنگل کے ہے''۔۳۶

(سرہند میں فارسی ادب،ص،۲۲،۲۱)

فیروز شاہ تغلق کے عہد میں سامانہ سے خزانے کو دوسری جگہ لے جانا سخت دشوار تھا،اس لیے علاقہ کے عوام نے مخدوم سے درخواست کی کہ سامانہ سے دہلی کے درمیان ایک نئے شہر کو بسایا جائے تاکہ خزانے کو بحفاظت لے جایا جاسکے۔اسطرح تاریخ مبارک شاہی سے یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ سرہند میں ۷۵۷ھ یعنی ۱۰۵۴ء میں ایک قلعہ تعمیر ہوا تھا۔سرہند ہمیشہ دہلی سلطنت کا مضبوط مرکز رہا ہے۔فیروز شاہ نے اس کو''فیروز پور'' کا نام دیا تھا۔جب کہ زبدۃ المقامات میں اس کا نام فیروز آباد لکھا گیا ہے۔ابوالفضل نے بھی اپنی کتاب آئین اکبری میں سرہند کے مطلق یہ درج کیا ہے۔کہ سرہند دہلی کی سرکار کا ایک حصہ ہے جس کے تحت ۳۱ محل اور پرگنے ہیں۔غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی اپنی کتاب سروآزاد میں سرہند کے بارے میں یہ ذکر کیا ہے۔

''سرہند کا پرانا نام سہرند تھا،غزنوی حکمراں نے غزنی سے
سہرند تک کا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا تو یہ عام طور پر سرہند
یعنی ہندوستان کا مشہور شہر ہو گیا۔'' ۳۷

(سروآزاد،ص ۸۷)

شاہ جہاں نے بھی جب کابل سے قزل باغ غزنی تک وسیع علاقہ فتح کرلیا تو اس وقت شاہ جہاں نے فرمان جاری کیا کہ اس کو سرہند کے بجائے سہرند ہی لکھا جائے۔لیکن اس کے باوجود بھی سرہند کے نام سے عوام میں مشہور رہا ہے۔سرہند کی تہذیب ایک انوکھی تہذیب

ہے پورے پنجاب کو اس تہذیب پر ناز ہے۔حتیٰ کہ سرہند کو تہذیبوں کا سنگم کہا جاتا ہے۔مغل حکمرانوں نے سرہند کی تہذیبی حیثیت کو کافی حد تک بچا کے رکھا ہے۔اس وقت بارونق اور سرسبز وشاداب شہر تھا۔کہا جاتا ہے کہ مغل حکمرانوں نے سرہند میں ۳۶۰ مسجدیں، سرائیں اور مقبرے بنائے تھے۔علاوہ ازاین انہوں نے کئی شاندار باغات اور فوارے بھی تعمیر کروائے تھے۔۱۶۷۵ء میں جہانگیر نے عام وخواص باغ تعمیر کروایا۔جس میں ایک محل اور ایک بڑا کنواں شامل ہے۔یہ جہانگیر کا دولت خانہ خاص تھا جس کا ذکر انہوں نے تزکِ جہانگیری میں کیا ہے۔شاہ جہاں نے ۱۶۳۴ء میں سرہند کی رہنے والی لڑکی سے شادی کی تھی۔جس کا مقبرہ آگرہ میں ہے۔بعد میں دہلی کے لاہوری گیٹ کے پاس میں اس کے نام سے ایک مسجد بنوائی تھی۔جو سرہندی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔سرہند کو لوگ اور حکمراں دونوں جنت کی سرزمین سے تعبیر کرتے تھے۔زبدۃ المقامات کے مصنف خواجہ محمد ہاشم کشمی نے اس خلد برین کے بارے میں یہ اشعار قلمبند کیے ہیں۔

کزان قندی کہ شیرین تر زجان است	کنون در خطِ ہندوستان است
الا سودائیاں شہریست درہند	کہ اندرپای اوبنماد سرہند
سوادش زلف رخسار فتوح است	غبارش توتیای چشم روح است
ازآں شہری کہ نامش معمرآمد	بعہد ما عجب کانی برآمد"۳۸

(زبدۃ المقامات،ص ۱۴۱)

بہرحال یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستان غزنوی سے لیکر مغلوں کے آخر تک فارسی کا دور دورہ رہا۔اس دور کو تاریخ میں خارجی دور کہا جاتا ہے۔کیونکہ فارسی زبان نے ہر اعتبار سے غلبہ پالیا تھا۔اس کے بارے میں خاص معلوم نہیں ہے کہ مغلوں سے پہلے فارسی کی تحصیل کے لیے ملک میں کسی اور زبان کو استعمال کیا جاتا ہے یا نہیں۔البتہ اتنا تو ضرور کہا جاتا ہے کہ ان ایام

میں فرہنگ نگار اپنی تالیفات میں بعض الفاظ کی تشریح میں ہندی زبان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔اور چونکہ ان الفاظ کا اکثر ذخیرہ آج اردواور دیگر زبانوں میں شامل ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ ان الفاظ کا تعلق پرانی فارسی سے تھا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کو فارسی سے ہی کے ذریعے سیکھا جاتا تھا۔ہمیں یاد رکھنا چاہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب بچہ کو فارسی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا،اور معلم کو بھی ضروری تھا کہ بچہ کو اسی زبان میں تعلیم دی جائے جو بچہ نے ماں کے گود سے سیکھی ہیں۔اس نقطہ نظر سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیسی زبان کو شروع سے ہی دیگر زبان جانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ہمیں مسودوں سے جو معلومات ملتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم نصابی کتابیں سب کی سب فارسی میں تھیں۔کیا یہ سمجھا جائے کہ جس طرح مقدس کتاب کو تبرک کے طور پر بچے کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں،اسی طرح فارسی کو بھی یہی حترام کیا جاتا ہے۔نہیں یہ صورت نہیں تھی ہندی زبان کو سمجھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔اگر چہ اس کے بارے میں تحریری مواد کی کمی نظر آتی ہیں،لیکن اتنا تو ضرور قیاس کیا جاتا ہے کہ اس وقت ایسا لٹریچر تیار کرنے کا دستور نہیں تھا۔اور یہ کسی حد تک واضع ہو رہا ہے کہ ذہین طلباء کے ذریعے خود فارسی ذریعہ معاش بن رہی ہے۔تاریخ سے یہ آ گائی ملتی ہے کہ مغل عہد سے پہلے ایسی وجود میں آئی ہیں۔جن کا تعلق مذہب وادبیات،لغات وتاریخ ،تصوف وعرفان،نجوم وتالیفات طب،موسیقی اور دوسرے فنوں سے ہے۔یہ سارے فارسی زبان میں ہیں۔بہرحال جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے قیام دہلی سلطنت یا عہد غزنوی کے دوران جس فارسی ادب کی بات کی جاتی ہیں وہ پنجاب کا ہی ادب ہے کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی حکومت انھیں علاقوں میں تھی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی ہندوستان کے علاقوں کی نسبت سے پنجاب میں فارسی زبان وادب کا فروغ پہلے ہو چکا تھا۔اس دوران جو بھی ادبی اشخاص پر تربیت ہوئی اس کے اثرات عوام پر بہت گہرے پڑھ گئے ہیں۔اور مسلسل یہی ادبی ذوق قائم

رہا۔اہل پنجاب نے اس معیار کو کمال عروج تک پہونچا دیا۔ پنجاب کے ادب شناسوں نے کبھی بھی اس معیار کو گرنے نہیں دیا۔اور کم وبیش ایک ہزار سال تک یہ اپنی قوت کے ساتھ مضبوط رہا۔اس ادب کو ہزار سال سے کم کبھی بھی نہیں کیا جا سکتا ہیں۔ فارسی رباعی کی بات کرتے ہوئے یہی پس منظر سامنے رکھنا چاہے۔ ہندوستان کے اولین شعراء مسعود سعد سلمان وابوالفرج رونی کی اگر بات کریں گے تو وہ بھی اس سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ پانچویں صدی ہجری کے مشہور غزل گو اور رباعی گو کی حیثیت سے ابھرے ہیں۔لاہور سے جب پایہ تخت کو دہلی منتقل کیا گیا اس وقت پنجاب کے ادبی ذوق پر تھوڑی سی فرق پڑھ گئی۔ بہر حال مذکورہ عبارت اور حوالوں سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے فارسی ادب میں پنجاب کو اہم مقام حاصل ہے۔اس ریاست نے فارسی ادبیات کے فروغ میں ہمیشہ ایک دل کا کام انجام دیا ہے۔ میرے خیال سے فارسی ادب میں پنجاب کا ذکر لازم وملزوم بنتا ہے۔ پنجاب کے ذکر کے بغیر فارسی ادب کا گوشہ ادھورا رہتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سرہند میں فارسی ادب، ڈاکٹر ادریس احمد، آعفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۱۹۸۸ء، ص ۲۰

۲۔ تاریخ اردو ادب، جلد، دوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل بک ہاوس دہلی، ۱۹۲۹ء۔ ص ۲

۳۔ فارسی ادب کے ارتقاء میں پانی پت کا حصہ، ڈاکٹر محمد اقبال، ایکزر ورٹک پرنٹرس ہاوس دریا گنج، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۷

۴۔ تاریخی وادبی مطالعہ، نذیر احمد، ایجوکیشنل بک ہاوس، دہلی، ۱۹۱۲ء ص، ۳۵

۵۔ آیینہ ہند، عباس مہرین شوتشری، ۱۳۵۱ھ، ص ۵

۶۔ فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر محمد ریاض اور ڈاکٹر صدیق شبلی، ص ۱۵۲

۷۔ تاجر الماثر، حسن نظامی نیشاپوری، سول لائن پرنٹنگ، دہلی، ص، ۴۹۳

۸۔ اردو فارسی اور پنجاب، ڈاکٹر محمد جمیل، روشنان پرنٹرس، دہلی ۔ ۶، ۲۰۱۷ء، ص، ۵

۹۔ ایضاً، ص، ۵

۱۰۔ مجلّہ تحقیق، نواب شیر محمد خان انسٹوٹ (مالیر کوٹلہ) پنجاب، ۱۹۹۴ء، ص ۶۹، ۷۰)

۱۱۔ سرہند میں فارسی ادب، ڈاکٹر ادریس احمد، آعفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۱۹۸۸ء، ص ۲۱

۱۲۔ فارسی زبان وادب: ایک ثقافتی مطالعہ ڈاکٹر سمیع الدین احمد ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی، ۱۹۶۴ء ص، ۴۱

۱۳۔ منتخب التواریخ، عبدالقادر بدایونی، کتابستان چندوارہ، ص، ۵۵

۱۴۔ طبقات ناصری، عبدالحی جیبی ، کابل ایڈیشن، ص، ۱۶۱

۱۵۔ اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مطبع مجتبائی، ۱۳۰۹ھ، ص ۱۰۹

۱۶۔ ایضاً، ص، ۱۲۱

۱۷۔ فارسی ادب کے ارتقاء میں پانی پت کا حصہ، ڈاکٹر محمد اقبال، ایکزرورٹک پرنٹرس ہاوس دریا گنج نئی دہلی، ۱۹۹۶ء، ص ۱۵۲

۱۸۔ تاریخ فرشتہ، اول، نولکشور کان پور ص ۱۴۴

۱۹۔ اردو فارسی اور پنجاب، ڈاکٹر محمد جمیل، ص، ۱۱۳، روشان پرنٹرس دہلی، ۲۰۱۷ء

۲۰۔ اردو رباعیات، ڈاکٹر عبدالسلام سندیلوی، نسیم بک ڈیپو، لاٹوش روڈ لکھنو ۱۹۹۳ء، ص ۱۶۸

۲۱۔ فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر ریاض احمد اور ڈاکٹر صدیق شبلی ، کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی ، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۵

۲۲۔ اردو فارسی اور پنجاب، ڈاکٹر محمد جمیل، ص ۱۱۴، روشان پرنٹرس دہلی، ۲۰۱۷ء

۲۳؎ سرہند میں فارسی ادب، ڈاکٹر ادریس، ص ۱۱۸، آعفیف آفسیٹ دہلی ۱۹۸۸ء

۲۴؎ اردو رباعیات، ڈاکٹر عبدالسلام سندیلوی، نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنوء ۱۹۹۳ء، ص ۱۶۸

۲۵؎ ایضاً، ص ۱۵۷

۲۶؎ فارسی ادب کے ارتقاء میں پانی پت کا حصہ، ڈاکٹر محمد اقبال، ایکرز رورٹک پرنٹرس دریا گنج نئی دہلی، ۱۹۹۳

۲۷؎ دبیر انٹرنیشنل جرنل، جنوری تا جون، لکھنوء، ۲۰۱۸ء، ص ۵

۲۸؎ ایضاً، ص، ۶

۲۹؎ ایضاً، ص، ۷

۳۰؎ پاکستان میں فارسی ادب، ظہورالدین احمد، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۴ء، ص ۸۸

۳۱؎ ایضاً

۳۲؎ پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ، ظہورالدین احمد، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۱۰

۳۳؎ مہابھارت، تہران ۱۳۵۷ھ، ص ۴۷۴

۳۴؎ تاریخ ہند، محمد ذکاءاللہ، نولکشور کانپور، ۱۸۹۸ء، جلد ۳، ص، ۸۳

۳۵؎ سرہند میں فارسی ادب، ڈاکٹر ادریس، آعفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۱۹۸۸ء، ص، ۲۲۔۲۱

۳۶؎ ایضاً

۳۷؎ سروِ آزاد، غلام علی آزاد بلگرامی، ص، ۸۷

۳۸؎ زبدۃ المقامات، خواجہ محمد ہاشم کشمی، نولکشور کانپور ص، ۱۴۱

باب سوم:

فارسی رباعی گوئی کی بحریں اور موضوعات

رباعی کافن

رباعی کی بحر پر گفتگو کرنے سے پہلے جب ہماری نظر عروض کی ایجاد پر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا کہ عروض وہ فن ہے جس سے اشعار کا وزن معلوم کرتے ہیں۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ عروض اہل عرب کی ایجاد ہے۔ اس کی ایجاد کا سہرا خلیل ابن احمد بصری کے سر جاتا ہے۔ جو تقریباً ۱۰۰ھ میں پیدا ہوا تھا۔ علم عروض کی ایجاد کے بارے میں بہت سی روایتیں موجود ہے۔ مصنف ''قواعد العروض'' نے تحریر کیا ہے کہ ایک دن خلیل ابن احمد بصری شہر مکہ کے بازار صفار سے گذر رہا تھا۔ اچانک اس نے سُنا کہ کسی نے طشت پر ہتھوڑا مارا۔ قدرتی طور پر خلیل علم موسیقی سے واقفیت رکھتا تھا۔ اس جھانکی آواز نے ان کو متوجہ کرلیا۔ اور وہ خوشی سے اچھل پڑا، اور اس کے منھ سے یہ کلمات بے ساختہ نکل پڑے۔

''واللہ یظہرُ مِن ھذا الشیٔ''

(یعنی خدا کی قسم اس سے کچھ چیز معلوم ہوتی ہے)

اس کے بعد خلیل بن احمد بصری کے دماغ میں موزونیت کا خیال پیدا ہوا۔ اور مشہور وزن حرفی فعل کی بنا پر فا دعین ولام سے عروض کے اوزان کو اختراع کیا۔

خلیل بصری کے علاوہ قاضی جہاں سیفی نے بدیع العروض میں لفظ ''کوبہ قصار'' کا استعمال کیا۔ اس کا مطلب کہ دھوبی کی موگری کی آواز سے عروض کا استخراج کیا گیا ہے۔ لیکن اس روایت کو قدر بلگرامی نے مسترد کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ موگری کی آواز سے نقرہ پیدا نہیں ہوسکتا، اور وہ تانبے کی آواز یا تار کی آواز کی طرح گھٹتی بڑھتی نہیں ہے یعنی اس میں جھنکار پیدا نہیں ہوتی ہے۔ قدر بلگرامی نے اس آواز نقرہ کو علم عروض کی بنیادی شے قرار دی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب قواعد العروض میں یوں بیان کیا ہے۔

''درحقیقت فن عروض علم موسیقی سے پیدا ہوتا ہے جب تار پر
مضراب لگائیں تو اس کو نقرہ کہتے ہیں۔ اس سے جھنکار پیدا
ہوتی ہے۔ اس کی جگہ حروف متحرک قائم کرلو۔ اور جہاں اس

آواز کا ٹھہراو ہو، اس کا نام سکتہ ہے۔ پس بجائے سکنات
حروف ساکن رکھ لو، جیسے مفاعیلن کہنا منظور ہے۔ پہلے دوبار
بے فاصلہ جلد جلد مضراب لگانے سے متواتر دو فقرے یعنی
متوالی دو متحرک جھنکاروں کی جگہ سمجھے جائیں گئے۔ اور آخر
میں ایک ساکن۔ وہ برابر ''مفا'' کے ہوگا۔ پھر ذرا فاصلہ پر
ایک فقرہ یعنی ایک متحرک پیدا ہوگا۔ جس کے آخر میں
خود بخود ایک ساکن ہوگا۔ وہ برابر ''عی'' کے ہے۔ پھر ذرا
فاصلہ دے کر ایک مضراب کا نقرہ ایک ساکن سمیت یعنی ایک
متحرک ''مع'' ایک ساکن پیدا ہوگا۔ اس جگہ ''لن''
سمجھو۔ اس طرح کل اوزان نکل سکتے ہیں''۔[1]

(قواعدالعروض، ص ۱۷)

بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ عروض آواز کی ترتیب کا نام ہے جس طرح مصوری میں رنگوں کی ترتیب سے حُسن پیدا ہوتا ہے اور شاعری میں لفظوں کی ترتیب سے دلکشی رونما ہوتی ہیں۔ اسی طرح موسیقی میں آوازوں کی ترتیب سے ایک جادو کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ آواز کے اُتار چڑھاو کا نام ہی عروض ہے۔ شاعری اور موسیقی کا آپسی رشتہ بہت گہرا ہے رقص سے موسیقی اور موسیقی سے شاعری پیدا ہوتی۔ جس طرح موسیقی کو فنون لطیفہ میں خالص ترین فن کہا جاتا ہے اس طرح موسیقی آوازوں کی موزوں تعمیر و ترتیب کا نام ہے۔ شاعری با معنی آوازوں کی ترتیب کو کہتے ہیں۔ موزوں اور با معنی آوازوں کے لئے ایک فن کی ضرورت ہے۔ اور وہی فن عروض کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شاعری کو اگر اوزان سے جدا کیا جائے تو شاعری بے جان ہوکر رہ جائے گی۔

اوزان کے دو بڑے فائدے ہیں۔ ایک تو اوزان سے شاعری کا پیمانہ یا سانچہ ملتا ہے یعنی اس کی ایک مقررہ موسیقی ہے ایک مصرع کے اسی پیمانے کے مطابق تکرار ہوتی ہے تو ذہن خوشگوار اثرات قبول کرتا ہے۔ چنانچہ عروض کی وجہ سے ذہن میں ایک خوش آہنگ پیدا ہوتا

ہے۔اس سے جھٹکے محسوس نہیں ہوتے ،دوسرے قافیہ کی موسیقی کا سوال آتا ہے ایک قافیہ دوسرے قافیہ کے لئے توقع پیدا کرتا ہے اور جب یہ توقع پوری ہوتی ہے تو حسن کاری کا ایک بھرپور احساس جاگ اٹھتا ہے۔اسی تکرار اور توقع پر ہی عروض کی اہمیت اور بنیاد ہے۔

بحر:۔بحر وہ وزن شعر جو ارکان کی تکرار یا تکرار و ترتیب کے ذریعہ کسی دائرہ کے تحت ہو۔

ابتداء میں ۱۵ بحریں تھیں جن کو خلیل ابن احمد بصری نے ایجاد کیا تھا۔وہ بحریں مندرجہ ذیل پیش کرتا ہوں۔

(۱)ہزج (۲)رجز (۳) رمل (۴)منسرح (۵)مضارع
(۶)مقتضب (۷)مجتث (۸) سریع (۹) خفیف (۱۰)طویل
(۱۱)مدید (۱۲)بسیط (۱۳)وافر (۱۴) کامل (۱۵)متقارب

اس کے بعد سولہویں بحر ایجاد ہوئی جس کا نام بحر متدارک رکھا گیا۔اس کا موجد ابوالحسن اخفش ہے اس کے بعد یوسف عروضی نیشا پوری نے سترھویں بحر ایجاد کی جس کا نام اس نے بحر قریب رکھا۔یہ پہلا شخص ہے جس نے فارسی زبان میں علم عروض کو تصنیف کیا۔یہ خلیل ابن احمد بصری کے دوسو سال بعد پیدا ہوا۔پھر مشاکل کی ایجاد ہوئی ،جس کے موجد کا نام اب تک معلوم نہیں ہوسکا ہے۔یہ اٹھارویں بحر ہے اس کے بعد بزرجمسر وزیر نوشیروان نے انیسویں بحر ایجاد کی جس کو بحر جدید کہتے ہے اس طرح بحروں کی کل تعداد انیس (۱۹) ہوگئی۔متاخرین نے بعد میں ۱۷ اور بحریں ایجاد کئیں ،جن کا ذکر منشی دیبی پرشاد سحؔر نے اپنی کتاب معیار البلاغت میں کیا۔ بحریں حسب ذیل پیش کرتا ہوں۔

(۱)غریض (۲)عمیق (۳)صغیر (۴)کبیر (۵)ندیل (۶)صریم
(۷)قلیب (۸)حمید (۹)صمیم (۱۰)سلیم (۱۱)حمیم (۱۲)زلل
(۱۳)اوفر (۱۴)جنب (۱۶)مواسع (۱۷)مرکن

مذکورہ ۱۷ بحروں کی اختراع سے کل بحروں کی تعداد ۳۶ ہوگئی۔لیکن متاخرین کی ایجاد کردہ بحریں زیادہ مشہور نہ ہوسکیں اور صرف ابتدائی ۱۵ بحریں شاعری کے بازار میں سکہ رائج الوقت قرار پائیں۔یعنی قدیم بحروں کو ہی شعراء نے زیادہ استعمال کیا۔قدیم انیس بحروں کو دو

حصوں میں منقسم کیا گیا۔ایک مفرد اور مرکب بحریں ۔حسب ذیل میں تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہوں ۔

مفرد اور مرکب بحریں:۔ انیس (۱۹) بحروں میں سے سات (۷) بحریں مفرد اور بارہ (۱۲) بحریں مرکب ہیں ۔مفرد بحریں وہ کہلاتی ہیں جن میں ایک ہی رکن کی تکرار ہوتی ہے اور جب کسی بحر میں دو رکنوں کی تکرار ہوتی ہے تو وہ مرکب بن جاتی ہے۔مثال نیچے پیش کرتا ہوں ۔

مفرد بحریں:۔

(۱) ہزج	مفاعیلن	چار بار
(۲) رجز	مستفعلن	چار بار
(۳) رمل	فاعلاتن	چار بار
(۴) وافر	مفاعلاتن	چار بار
(۵) کامل	متفاعلن	چار بار
(۶) متقارب	فعولن	چار بار
(۷) متدارک	فاعلن	چار بار

مرکب بحریں:۔

(۱) منسرح	مستفعلن	مفعولات	دو بار
(۲) مقتضب	مفعولات	مستفعلن	دو بار
(۳) مضارع	مفاعیلن	فاع لاتن	دو بار
(۴) مجتث	مس تفع لن	فاع لاتن	دو بار
(۵) طویل	فعولن	مفاعلن	دو بار
(۶) مدید	فاعلاتن	فاعلن	دو بار
(۷) بسیط	مستفعلن	فاعلن	دو بار
(۸) سریع	مستفعلن مفعولات	مستفعلن	دو بار

(۹) خفیف	فاعلاتن	مستفعلن	دوبار
(۱۰) جدید	فاعلاتن	فاعلاتن مستفعلن	دوبار
(۱۱) قریب	مفاعیلن	مفاعیلن فاع لاتن	دوبار
(۱۲) مشاکل	فاع لاتن	مفاعیلن مفاعیلن	دوبار

فک بحراور زحافات بحر:۔

جب ایک بحر کے ارکان کے تغیر سے دوسری بحر پیدا ہو تو اس کو فک بحر کہتے ہیں۔مثلاً بحر ہزج کا رکن مفاعیلن ہے اس میں ''مفا'' وتد مجموع اور ''عی'' سبب خفیف ہے اور ''لن'' بھی سبب خفیف ہے۔اب اگر ہم اس میں تغیر کرنا چاہیں تو ''لن'' یعنی ایک سبب خفیف کو پہلے رکھیں۔اس کے بعد ''مفا'' یعنی وتد مجموع کو رکھیں۔آخر میں ''عی'' دوسرے سبب خفیف کو رکھیں۔اس طرح یہ رکن ''لن مفا'' ہو جاتا ہے۔یہ فاعلاتن کے ہم وزن ہے۔اب یہ بحر رمل کا رکن ہو گیا۔

زحافات کا مطلب ہے ارکان کے حروف کو گھٹانا، بڑھانا۔اس تغیر و تبدل کی ضرورت اہل فارس کو پیش آئی۔وجہ یہ تھی کہ اہل عرب نے ایسی بحریں ایجاد کی تھیں جو ان کے ملک اور ماحول کے مطابق تھیں۔مگر جب یہ بحریں ایران میں عربوں کے تسلط کے بعد پہونچیں تو اہل فارس کو پسند نہ آئیں۔کیونکہ مزاج اور ماحول مختلف تھا۔اس لئے انھوں نے عربی بحروں میں تبدیلی کر لی۔انھیں تبدیلیوں کو زحافات کہتے ہیں۔ارکان اگر اشعار میں اپنی اصلی صورتوں میں ہیں تو بحر سالم کہیں گے اور اگر کسی رکن میں تغیر ہوگا تو اسے مزاحف کہتے ہیں۔زحافات سے ارکان میں چودہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔بحر الفصاحت کے مطابق زحافات کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) اضافہ یا کسی حرف کی زیادتی

(۲) کسی ایک یا ایک سے زائد حروف کا گرنا۔

(۳) ساکن حرف کو متحرک کرنا۔[۲]

(بحر الفصاحت،ص۱۰)

بحر ہزج:۔

یہاں ہم کومختلف بحروں اوران کے زحافات سے بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔کیونکہ ان بحروں سے رباعی کا کوئی تعلق نہیں ہے رباعی کا تعلق صرف بحر ہزج سے ہے اس لئے بحر ہزج اوراس کے زحافات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔بحر ہزج مفاعیلن کی چار بار تکرار سے پیدا ہوتی ہے۔ہزج لغت میں اچھی آواز اور گانے کو کہتے ہیں۔چونکہ عرب میں اکثر اسی وزن کے اشعار گائے جاتے تھے۔اس لئے اس بحر کا نام ہزج رکھا گیا ہزج کی اصل مسدس ہے مگر شعراء فارسی نے مثمن بھی استعمال کیا ہے۔یہ بحر مترنم ہونے کے سبب نہایت کثیر الاستعمال ہے اس بحر کو بحر رباعی بھی کہتے ہیں۔حکیم نجم الغنی رام پوری کے مطابق زحافات بحر ہزج مندرجہ ذیل ہے۔

زحاف	تشریح
(۱) خرم	وتد مجموع کا پہلا حرف گرادینا۔
(۲) کف	رکن کے ساتویں حرف کو گرادینا۔
(۳) قصر	حرف ساکن سبب خفیف کو جو رکن کے آخر میں آئے گرادینا۔
(۴) قبض	رکن کے پانچویں حرف ساکن کو جو سبب میں ہو گرادینا۔
(۵) شتر	خرم اور قبض کا جمع ہونا۔
(۶) حذف	سبب خفیف جو رکن کے آخر میں ہو گرادینا۔
(۷) خرب	اجتماع خرم و کف
(۸) ہتم	حذف اور قصر کے زحاف کا رکن میں جمع ہونا۔
(۹) جبّ	سبب خفیف جو آخر رکن میں ہوں ان کو حذف کر دینا۔
(۱۰) زلل	زحافات خرم وہتم کا جمع ہونا۔
(۱۱) بتر	اجتماع خرم وجبّ
(۱۲) تسبیغ	ایک سبب خفیف کے بیچ میں جو آخر رکن میں واقع ہو الف

زیادہ کرنا

مذکورہ بالا بحر ہزج کے زحافات ہیں۔بحرالفصاحت کے مطابق رباعی میں صرف نو زحافات آتے ہیں۔جودرجِ ذیل ہیں:

''خرب،خرم،قبض،کف،ہتم،جبّ،بتر،شتر،اورزلل۔'' ۳ے

(بحرالفصاحت،نجم الغنی رامپوری،ص ۲۷۵)

رباعی کی بحر کے ارکان:۔

رباعی کی بحر کے ارکان مزاحف اور سالم مل کر بعض ادب شناسوں کے نزدیک اٹھارہ (۱۸) اور بعض کے نزدیک چوبیس (۲۴) وزن ہیں۔مگر زیادہ تر چوبیس ہی اوزان پر متفق ہیں۔یہ چوبیس اوزان دس ارکان سے مل کر بنتے ہیں جن کا ذکر حکیم نجم الغنی نے بحر الفصاحت میں یوں کیا ہے۔

(۱) رکن مفاعیلن سالم ہے۔

(۲) مفعولن اخرم ہے جس کو مخنق بھی کہتے ہیں۔

(۳) مفعول بضم لام اخرب ہے۔

(۴) مفاعلن مقبوض ہے۔

(۵) مفاعیل مکفوف ہے (لام مضموم سے)

(۶) فعول ہتم ہے (لام موقوف سے)

(۷) فعل مجبوب ہے۔

(۸) فع ابتر ہے۔

(۹) فاعلن۔اشتر ہے

(۱۰) فاع۔ازل ہے۔

رباعی کی بحر کے دائرے:۔ابن قیس نے حدائق میں قلم بند کیا ہے کہ خواجہ امام حسن قطان نے چوبیس اوزان کو ترتیب میں لانے کے لئے دو شجرے تیار کئے ہیں۔دونوں شجروں کو مولانا حکیم نجم الغنی رام پوری نے بحرالفصاحت میں نقل کیا ہے۔جو درج ذیل ہیں۔

(الف)دائرہ اخرب الصدور والا بتدا:

(۱)مفاعلن مفاعیلن فاع

(۲)مفاعیل مفاعیلن فاع

(۳)مفاعیل مفاعیل فعل

(۴)مفاعیلن مفعولن فاع

(۵)مفاعلن مفاعیلن فع

(۶)مفاعیل مفاعیلن فع

(۷)مفاعیلن مفعول فعول

(۸)مفاعیلن مفعولن فع

(۹)مفاعیلن مفعول فعل

(۱۰)مفاعیل مفاعیل فعول

تفصیل:۔

(۱)ایک جز حشو کا مقبوض اور ایک سالم اور عروض وضرب ازل ہوں۔

(۲)ایک جز حشو کا مکفوف اور ایک سالم اور عروض وضرب ازل ہوں۔

(۳)دونوں جز حشو کے مکفوف اور عروض وضرب مجبوب ہوں۔

(۴)حشو کا ایک جز سالم اور ایک اخرم اور عروض وضرب ازل ہوں۔

(۵)ایک جز حشو کا موبوض اور ایک سالم اور عروض وضرب ابتر ہوں۔

(۶)ایک جز حشو کا مکفوف اور ایک سالم اور عروض وضرب ابتر ہوں۔

(۷)ایک جز حشو کا سالم دوسرا اخرب اور عروض وضرب اہتم ہوں۔

(۸)ایک جز حشو کا سالم دوسرا اخرم اور عروض وضرب ابتر ہوں۔

(۹)ایک جز حشو کا سالم دوسرا اخرب اور عروض وضرب مجبوب ہوں۔

(۱۰)حشو مکفوف ہو اور عروض وضرب اہتم ہوں۔

(۱۱)حشو میں ایک جز مقبوض ایک جز مکفوف اور عروض وضرب اہتم ہوں۔

(۱۲) حشو میں ایک جز مقبوض ایک جز مکفوف اور عروض وضرب مجبوب ہوں۔

دائرہ اخرم الصدر والابتدا:

(۱) فاعلن مفاعیلن فاع

(۲) مفعول مفاعیلن فاع

(۳) فاعلن مفاعیل فعل

(۴) مفعولن مفعولن فاع

(۵) مفعولن مفعولن فع

(۶) فاعلن مفاعیلن فع

(۷) مفعول مفاعیل فعول

(۸) مفعول مفاعیلن فع

(۹) مفعولن مفعول فعل

(۱۰) مفعول مفاعیل فعل

(۱۱) فاعلن مفاعیل فعول

(۱۲) مفعولن مفعول فعول

تفصیل:

(۱) حشو کا ایک جز اشتر ایک سالم اور عروض وضرب ازل ہوں۔

(۲) حشو کا ایک جز اخرب ایک سالم اور عروض وضرب ازل ہوں۔

(۳) حشو کا ایک جز اشتر ایک مکفوف اور عروض وضرب ازل مجبوب ہوں۔

(۴) حشو اخرم اور عروض وضرب ازل ہوں۔

(۵) حشو اخرم اور عروض وضرب ابتر ہوں۔

(۶) حشو کا ایک جز اشتر اور ایک سالم اور عروض وضرب ابتر ہوں۔

(۷) حشو کا ایک جز اخرب ایک مکفوف اور عروض وضرب اہتم ہوں۔

(۸) حشو کا ایک جز اخرب ایک سالم اور عروض وضرب ابتر ہوں۔

(۹) حشو کا ایک جز اخرم ایک اخرب اور عروض وضرب مجبوب ہوں۔

(۱۰) حشو کا ایک جز اخرب ایک جز مکفوف اور عروض وضرب مجبوب ہوں۔

(۱۱) حشو کا ایک جز اشتر ایک جز مکفوف اور عروض وضرب اہتم ہوں۔

(۱۲) حشو کا ایک جز اخرم ایک جز اخرب اور عروض وضرب اہتم ہوں۔

انھیں شجروں کو انشاء اللہ خاں انشآء نے اپنے رسالہ ''دریائے لطافت'' میں بھی پیش کیا ہے۔انشآء نے قابلیت کی بناء پر ان اوزان کا شجرۃ الاخرب اور اوزان شجرۃ الاخرم میں نئے الفاظ میں وضع کیا ہے۔جس کو یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔

رباعی کے اوزان کی خصوصیات:۔

رباعی کے لیے جو چوبیس اوزان مخصوص ہے وہ سب اثر اور خصوصیت میں یکساں نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں فرق ہے جن اوزان کے اسباب واوتاد میں اعتدال ہے وہ خفیف اور مطبوع ہیں۔لیکن جن اوزان میں اسباب واوتاد زیادہ ہیں وہ ثقیل اور نا مطبوع ہیں۔اس بات کی وضاحت یہاں ضروری ہے کہ دائرہ اخرب کے اوزان دائرہ اخرم کے اوزان کے مقابلہ میں سُبک اور مطبوع ہیں۔اوزان اخرب میں سب سے زیادہ سُبک اور ہلکا وزن مفعول مفاعلن مفاعیل فعل ہے اور سب سے زیادہ ثقیل وزن مفعول مفاعیلن مفعولن فع ہے۔کیونکہ اس میں چھ سبب متواتر واقع ہوتے ہیں۔اخرم کے اوزان میں سب سے زیادہ سُبک مفعولن فاعلن مفاعیل فعول ہے، کیونکہ اس میں چار سبب اور چار وتد آئے ہیں۔اور سب سے زیادہ ثقیل مفعولن مفعولن مفعولن فع ہے کیونکہ اس میں سب سبب جمع ہیں۔

بحر رباعی کی تقطیع:۔اس سے پہلے کہ رباعی کی تقطیع کی جائے تقطیع کے عام اصولوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔تقطیع کے اصولوں سے واقفیت کے بغیر رباعی کی بحر کی تقطیع میں دشواری پیش آئے گی۔مرزا محمد حسن عسکری نے تقطیع کی تعریف یوں کی ہے۔

> ''تقطیع کے لغوی معنی قطع کرنا یا کاٹنا ہیں۔مگر اصطلاح میں
> شعر کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں تا کہ اس کا وزن
> عروض کے مقررہ اوزان میں کسی کے مطابق پایا جائے''۔[۲۴]

(بحر الفصاحت، ص ۴۴۵)

ملفوظ غیر مکتوب:۔ تقطیع کرتے وقت دو قسم کے حروف کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے ۔پہلی قسم کے حروف ملفوظ غیر مکتوب کہلاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ حروف تلفظ میں آئیں مگر لکھے نہ جائیں ۔حروف تقطیع میں محسوب ہوتے ہیں ۔ یہ حروف مندرجہ ذیل ہیں ۔

(۱) کسرۂ اضافت: جیسے درد سر دوستاں آہ فغاں من است ۔اس میں ''درد سر'' برابر ہے ''درد سرے'' کے یعنی کسرۂ اضافت ''یے'' کے برابر ہے ۔اور مفتعلن کے ہم وزن ہے ۔

(۲) الف ممدودہ جیسے آمد ۔اس کا الف ممدودہ برابر ہے دو الف کے اور فعلن کے ہم وزن ہے ۔

(۳) حروف مشدّد ۔جیسے تمتع ۔اس میں تیسرا حروف (ت) دوبار پڑھا گیا ہے ،یعنی (تمت تع) اور فعولن کے ہم وزن ہے ۔

(۴) واؤ اور ''ی'' جس پر ہمزہ ہو جیسے (داؤد) اس میں ہمزہ ایک ''واؤ'' کے برابر ہے لہذا واؤ دو ہو گیا اور مفعول کے ہم وزن ہے ۔اسی طرح لفظ جائے ۔اس میں (ے) پر ہمزہ ہے جو ایک (ے) کے برابر ہے ۔لہذا یہ ''جائے'' ہو گیا اور فعلن کے ہم وزن ہے ۔

مکتوب غیر ملفوظ:۔ دوسری قسم کے حروف مکتوب غیر ملفوظ کہلاتے ہیں ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حروف جو لکھے جائیں مگر پڑھے نہ جائیں ایسے حروف تقطیع میں محسوب نہیں ہوتے ہیں ۔ یہ حروف مندرجہ ذیل ہیں ۔

(۱) واؤ معدولہ:۔ جیسے خواب ۔اس کا واؤ عطف جو کھینچ کر نہ پڑھا جائے تقطیع میں نہیں آئے گا ۔

(۲) واؤ عطف ۔وہ واؤ عطف جو کھینچ کر نہ پڑھا جائے تقطیع میں نہیں آئے گا ۔جیسے ''دو کس را کہ باشد بہم جان و ہوش'' اس میں دو کس تلفظ کے اعتبار سے برابر ہے وکس ۔اس لئے دو کا واؤ تقطیع میں شمار نہیں کیا جائے گا ۔

(۳) واؤ عطف:۔ یہ اگر کھینچ کر پڑھا جائے گا تو تقطیع میں شمار کیا جائے گا جیسے گنہ بیند و پردہ پوشد بہ علم بینداور پردہ کے مابین کا واؤ کھینچ کر پڑھا جا رہا ہے ۔

(۴) الف وصل :۔ الف وصل اگر چہ لکھا جاتا ہے مگر چونکہ تلفظ میں نہیں آیا ہے اس لئے تقطیع کرتے وقت گر جائے گا ۔ جیسے مثال کے طور پر ''بفرسنگ بگرنیر د ازتو رفیق بگر نیر دازتو کو۔بگرنیر دزتو۔ پڑھا جائے گا اس طرح سے الف گر جاتا ہے جو تقطیع میں نہیں آئے گا۔

(۵) نون غنہ :۔ وہ نون جو الف۔ واؤ یا ساکن کے بعد آئے اور ناک میں پڑھا جائے۔ تقطیع میں شمار نہیں کیا جاتا ہے جیسے ''چوں'' برابر ہے ''چو'' کے۔اور ایں برابر ہے ''ای'' کے۔لہذا یہ دونوں نون غنہ تقطیع میں گر جائیں گے۔

(۶) ھائے مختفی :۔ جیسے بادہ پرست ۔ یہ لفظ پڑھا جائے گا ''بادپرست'' اس طرح سے ''ہ'' گر جاتی ہے جو تقطیع میں نہیں آئے گی ۔

جیسے بادہ پرست ۔ یہ لفظ پڑھا جائے گا ''بادپرست'' اس طرح سے ''ہ'' گر جاتی ہے جو تقطیع میں نہیں آئے گی ۔

رباعی کے لیے بحر کی ضرورت :۔ رباعی ایک مخصوص بحر میں کہی جاتی ہے۔گذشتہ سے ہی رباعی کے لیے بحر ہزج کو متعین کیا گیا۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیگر اصناف ادب کے باوجود رباعی کے لیے ہی بحر کیوں لازم ہے۔اکثر تذکروں اور ادبی تاریخوں میں دیکھنے کو ملا ہے کہ رباعی اخرب واخرم کے چوبیس اوزان میں ہی کہی جاتی ہے۔اس لیے استاتذہ کرام اور دیگر علم پرور اشخاص نے رباعی کو کسی اور بحر میں نہیں لکھا۔البتہ ایسا ضرور ادب میں دیکھنے کو ملتا ہے کہ رباعی کی بحر میں دیگر اصناف سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔محمد بن قیس رازی نے المعجم میں یوں بیان کیا ہے۔

''فرخی قصیدہ گفتہ بروزن دوبیتی'' ۵

(المعجم قلمی نسخہ،ص،۶۷۲)

المعجم کے قلمی نسخہ میں فرخی کے قصیدہ کے اشعار کو پیش نہیں کیا گیا۔لیکن مطبوعہ نسخہ میں فرخی کے ایک شعر کو بیان کیا گیا ہے۔نمونے کے طور پر ایک مطلع درج ذیل ہے۔

سردی گر سرو ماہ دارد بر سر ماہی گو ماہ مشک بار و منبر

اس شعر کی تقطیع حسب ذیل ہے۔

سردی گر سرو ما ہ دارد بر سر ۔۔۔۔ ماہی گر ماہ مش کہ بار و من بر

یہ وزن دائرہ اخرم کے چھٹے خانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح شعراء نے غزل میں بھی رباعی کی بحر کا استعمال کیا۔ حضرت امجد حیدر آبادی، خیامؔ اور رومیؔ نے بھی رباعی کے اخرب کے وزن کو استعمال کیا ہے۔ بہرحال ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رباعی کی بحر میں دیگر اصناف سخن کی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اب یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ رباعی ہی کو دیگر بحر میں کیوں نہیں لکھا جاتا ہے جب کہ باقی اصناف جیسے غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی اور دیگر اصناف سخن کو مختلف بحروں میں بیان کیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ جو چند مثالیں بیان کی ہے جن سے ثابت ہوتا کہ رباعی کی بحر میں دیگر اصناف سخن کی طبع آزمائی کی جاسکتی ہے البتہ رباعی کسی اور بحر میں نہیں کہی جاسکتی ہے۔ اب بات یہ ہے کہ یہ پابندی اس مخصوص صنف سخن پر کیوں عائد کی گئی۔

اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ رباعی ابتداء سے ہی ایک مخصوص انداز اور مخصوص بحر کی حامل رہی ہے۔ چاہے آپ رباعی کے اتفاق وجود پر نظر ڈالیں یا رباعی کے ارتقائی نمود کو ذہن میں رکھیں۔ مگر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ رباعی نے ابتداء سے ہی ایک مخصوص وزن اور ڈھانچہ اختیار کیا ہے۔ بعد کے ادب شناسوں پر بھی یہی لازم بن چکا ہے۔ کسی نے بھی مذکورہ مخصوص ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی جرات نہیں کی۔ یہی وہ خاص خصوصیت ہے جس کی بدولت رباعی گوئی دوسری اصناف سخن سے انوکھی نظر آتی ہے۔ اس ترنم رنگ کی وجہ سے رباعی کو باقی اصناف ادب پر ترجیع حاصل ہے۔ ہر کوئی اس کے شان وشوکت پر متفق ہے۔ گذشتہ سے عہد حاضر تک یہی ڈھانچہ استعمال ہوتا رہا ہے۔

اس کے علاوہ رباعی کو مخصوص بحر متعین ہونے کی دلیل یہ ہے۔ کہ جس بحر کو رباعی کے لیے مخصوص کیا گیا ۔ وہ بحر اس صنف سخن کے لیے نہایت مترنم ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی اور بحر میں اس طرح کا ترنم نہیں پایا جاتا ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ رباعی کو اگر دیگر بحروں میں بیان کیا جائے تو اس قدر نغمہ ریز ونغمہ سیر نہیں ہوسکتی ہے۔ اس لیے عرصہ قدیم سے ہی علم

وادب کے فنکاروں نے رباعی کے لیے اس مخصوص بحر کو قائم و دائم رکھا۔تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اگر بعض اساتذہ کرام نے متزاد رباعیاں بھی کئی ہیں لیکن ہر کوئی بحر کا پابند رہا اور مخصوص بحر کو تبدیل کرنے کی جرات کسی نے نہیں کی۔ان شعراء کی کوشش اجتہادی حد تک محدود رہی ہے۔مثلاً بابا طاہر عریاں،ابوسعید ابوالخیر،سرمد وغیرہ نے رباعیات کو بحر ہزج میں نہیں لکھا تھا بلکہ انہوں نے بحر ہزج مسدس محذوف میں لکھا تھا۔یہی رجحان پنجاب کے اعلیٰ پایہ شاعر علامہ اقبال کا بھی رہا ہے انھوں نے بھی بابا طاہر عریاں کا رنگ اختیار کیا ہے۔ان کی رباعیات بھی بحر اخرب واخرم میں نہیں ملتی ہیں۔مثلاً

بہ کویش رہ سپاری اے دل اے دل مرا تنہا گزاری اے دل اے دل

دما دم آرزوہا آفرینی مگر کارے نداری اے دل اے دل

اسکے علاوہ اور بھی شعراء نے مخصوص حد بندی سے ہٹ کر رباعی کو کہنے کی کوشش کی تھی مثلاً عظمت اللہ خان نے رباعی کو ہر بحر میں کہنے کا مشورہ دیا ہے ان کی عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

> ''اس میں کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ رباعی کے لئے خاص بحریں معین کی جائیں یا یہ کہ مقرر کر لینے کے بعد ان کے سوا کسی بحر میں رباعی نہ لکھی جائے۔رباعی کی چوبیس بحروں میں بیشتر نہایت بھونڈی اور ثقیل ترنم کی ہیں۔ہونا چاہیے کہ شاعر یہاں بھی آزاد رہے اور جس بحر میں چاہیے رباعی لکھے۔بے قافیہ نظم میں چونکہ قافیہ جو ترنم کے لیے ایک خوش آئیندہ بحر کا معین کر لینا اس لیے لازم ہو جاتا ہے کہ بے قافیہ نظم پھیکی نہ ہو جائے لیکن انگریزی عروض پھر بھی شاعری کو آزادی رکھتی ہے کہ جس بحر میں چاہیے لکھے۔لیکن رباعی میں قافیہ ضروری ہے تو پھر کسی بحر یا بحروں کا تعین ضروری نہیں رہا''[۶]

(اردو رباعیات، ص،۶۸۰)

عظمت اللہ خان کی رائے صحیح ہے یا نہیں ۔اس بات پر زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے مگر یہ بات بالکل واضع ہے کہ عظمت اللہ خاں کی رائے پر شعراء نے بہت کم عمل کیا ہے اور زیادہ شعراء نے رباعی کو بحر کے مقررہ اوزان ہی میں رباعی کہا ہے ۔علاوہ ازاین کچھ اور مولفین نے اس معاملے میں بے توجہی اختیار کی ہے انھوں نے چار مصرعے کہیں بھی دیکھے رباعی کہہ کر بیٹھے ،مثلاً ''رباعیات سرمد'' میں کچھ رباعیاں ایسی بھی ملتی ہیں ۔جو اخرب واخرم کے اوزان میں نہیں آتی ہیں ۔مگر مولف نے ان بھی رباعیات کے زمرہ میں شامل کر دیا ہے ۔البتہ یہ معلوم نہیں ہوا کہ شاعر مذکور بھی ان کو رباعیات سمجھتے تھے یا مولف نے غلطی سے ان کو رباعیات سمجھ لیا ہے ۔بہر حال رباعیات سرمد کے چند نمونے پیش کرنے کی سعادت کرتا ہوں ۔

(۱) اعتبار وعدہ ہاے مردم دنیا غلط ہای غلط، آرے غلط، امشب غلط، فردا غلط
نسخہ بینائی دیوان عمر ما مپرس خط غلط، معنی غلط، انشا غلط، املا غلط

(۲) ترک کردم چارہ ہائے جملہ از ماواے خویش
نورحق رادیدہ ام از یرتا بالائے خویش
گرتو می خواہی چنین ہم شو جدا از جائے خود
تا بنی مظر حق خود بسر تا پائے خویش ۔ے

(رباعیات سرمد، ۵۵۔۵۶)

اس کے علاوہ تذکرہ مخطوطات جلد سوم میں ڈاکٹر زور نے سید محمد گیسو دراز کی مندرجہ ذیل رباعی پیش کی ہے ۔جو رباعی کی اصلی بحر میں نہیں ہے :۔

دوش دیدم شہِ حسین اندر بلا گفتم اے شاہِ شہیدِ کربلا
سیدان سنی ازنسل تواند گفت لا واللہ لا واللہ را

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے بھی اصلی رباعی اور نقلی رباعی میں کوئی فرق واضع نہیں کیا۔ایک رباعی میں ایک چھت ہوا شامقرہ خود انہیں بیویوں کی زبان سے کہہ جاتے

ہیں۔فقرے کوحسن قبول وہ عطا ہوتا ہے کہ چالیس پنتالیس سال کے اندر بےشمار زبانوں پر آچکا ہے محفلوں کو گرما چکا ہے بوڑھے تو بوڑھے بچوں میں کم ایسے ہوں گئے جو نہ تیں چکے ہوں۔اہل عروض نے رباعی اور قطعہ کے امتیاز کے لیے جو اصول مقرر کر دیے ہیں۔اب انہیں اصولوں کی روشنی میں ہم جانچ سکتے ہیں کہ کوئی بھی چار مصرع رباعی کی شکل میں ہے یا قطعہ کی شکل میں ہے۔اس کے علاوہ مئولف غیاث الغات کا قول بھی ہم کو رباعی اور قطعہ کے امتیاز میں مدد دیتا ہے۔وہ لکھتے ہیں۔

''وزنش خاص این است'' لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' واگر بر
ین وزن نہ باشد آں راقطعہ گویند، رباعی نہ گویند''۸

(غیاث الغات،ص،۲۱۷)

علاوہ ازاین پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی کتاب تنقید شعرالعجم میں رباعی کی مخصوص بحر پر زور دیتے ہوئے یوں رقم طراز کیا ہے:۔

''ادبی وعروضی نقطہ نظر سے بھی اور رواجاً بھی رباعی وہی ہے
جو بحر ہزج کے اخرب واخرم کے چوبیس اوزان مقررہ میں
سے ہو''۹

(تنقید شعرالعجم،ص،۵۶۲)

جلال الدین احمد جعفری نے ''العروض والقوافی'' میں رباعی کے بحر کے بارے میں یوں بیان کیا ہے۔

'' رباعی کے وزن کو شعراءعجم نے بحر ہزج سے نکالا ہے
سوائے اس بحر کے اور کوئی بحر رباعی میں کام نہیں آتی''۱۰

(العروض والقوافی،ص۶۵)

ایک اور بات جس کو بیان کرنا لازم سمجھتا ہوں۔وہ یہ ہے کہ بحر کے علاوہ رباعی کو جانچتے وقت اس کے مطلع پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے۔اگر رباعی میں مطلع نظر آئے تو رباعی سمجھو اور اگر مطلع نظر نہیں آئے تو قطعہ مقرر کر دو۔بہر حال مذکورہ مثالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رباعی اور

قطعہ کے درمیان ایک حد فاصل قائم کی جا سکتی ہے۔ دراصل ان دونوں اصناف کو جدا جدا ہی رہنا چاہیے۔ تا کہ دونوں کا وجود قائم رہے۔ اس کے علاوہ شعراء کو بھی رباعی اور قطعہ کہنے اور سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔ اس طرح سے دونوں اصناف سخن کا دامن وسیع ہو گا اور فارسی ادب کو بھی ترقی نصیب ہو گی۔

موضوعات کے حوالے سے رباعی کا تعارف:

صنف رباعی کے علاوہ باقی اصناف ادب میں جس طرح شاندار اور پر شکوہ الفاظ کی ضرورت ہے مثال کے طور پر اگر غزل کی بات کریں گے اس کے لیے نرم و نازک سبک اور شیرین الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح رباعی کے لئے بھی دقیق الفاظ اور مخصوص پیکروں کی ضرورت ہوتی ہیں۔ رباعی چاہے فکریہ ہو یا طربیہ زبان کی بلاغت اور معنی آفرینی کی بڑی اہمیت درکار ہوتی ہے۔ اس صنف سخن میں شاعر کو کفایت شعاری سے کام لینا پڑتا ہے۔ تقلیل وارتکاذ فن رباعی کے اہم مطالبات ہیں۔ شاعر الفاظ کے انتخاب میں بہت محتاط ہوتا ہے تا کہ اپنے وسعت الفاظ سے موزوں لفظ منتخب کر لیے۔ اس کے الفاظ اتنے موزوں ہو کہ الف ب بنا سکے۔ جب ہم پنجاب کے موضوعات کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو ہماری نظر سب سے پہلے متصوفانہ اور اخلاقی نوعیت کی رباعیوں پر پڑتی ہے۔ اس لیے رباعی گو شعراء کی زبان سنجیدہ، پر اثر اور سادہ نظر آتی ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان کے دیگر علاقوں پر نظر ڈالیں تو وہاں کے صنف رباعی میں فکر و احساس کا خوبصورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ پنجاب کے رباعی گو شعراء نے رباعیوں میں محض فکر کو جگہ نہیں دی۔ بلکہ خیال کی پیشکش کے علاوہ انہوں نے اس صنف سخن سے جذبات و جوش کی عکاس بھی کی ہے۔ جس کی وجہ سے رباعیوں کی زبان نہ صرف پر جوش، اثر دار، خیال انگیز، شرین وشگفتہ ہوئی بلکہ نکھار وشادابی اور رنگینی رباعی گوئی میں پیدا ہوئی ہے۔ پنجاب کے رباعی گو شعراء کے کلام میں فکر و احساس سادگی و پر کاری،

متانت و شگفتی وشرینی ،تفکر و تاثیر کے خوبصورت نمونہ نظر آتے ہیں ۔ پنجاب کے شعراء نے فارسی رباعی میں زبان کو بہت آسان و سادہ طریقے سے استعمال کیا ہے ۔اگر پنجاب کے شعراء کے غزلوں اور رباعیوں کا موازنہ کریں گے تو اخذ ہوتا ہے کہ غزل کے نسبت رباعیوں کی زبان نسبتاً رواں سادہ شگفتہ اور صاف ہے ۔نمونہ کے طور پر علامہ اقبال کی رباعی پیش کرتا ہوں ۔

بیا ساقی بگرداں جام مے را زمے سوزندہ تر کن سوز نے را

دگر آن دل بنہ در سینہ من کہ پیچم پنجہ کاؤس و کے را

پنجاب کے رباعی گوشعراء کے رباعیوں میں مضامین اور موضوعات میں جیسی رنگا رنگی ،تنوع ، وسعت اور ہمہ گیری نظر آتی ہے ۔اسی طرح رباعیوں میں تھوڑا مشکل پن بھی نظر آتا ہے ۔رباعی اپنے سخت پن کے برعکس بھی پنجاب میں بہت نامور ہوئی ہے ۔ پنجاب کے شعراء نے رباعی کے مضامین کو بہت حد تک وسیع کرنے کی کوشش کی ہے ۔شاعروں نے رباعیوں میں ہر قسم کے موضوعات وتصورات اور جذبات واحساسات کے اظہار کے قابل بنا دیا ۔جیسا کہ تصور کیا جاتا ہے کہ صنف رباعی میں زیادہ تر پند وموعظت اور اخلاق وتصوف کے نکات کی ترجمانی کے لیئے استعمال ہوتی تھی ۔رباعی میں محبوب مجازی کی صد جلوہ گری کو شامل کر کے اس صنف میں ارضیت ، مادیت اور واقفیت کا اضافہ کیا اور عشقیہ و شبابیاتی رباعیاں پیش کیں ۔کبھی پنجاب کے شعراء نے خیام کی طرح شراب ومستی کے مضامین باندھے اور کبھی زندگی کے اعلیٰ وارفع قدروں کی طرف اشارے کئے اور کبھی رباعی میں صوفی کے دل کا خلوص اور اس کی تڑپ سمو دی ۔ادب شناسوں نے رباعیات کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے ۔

۱ ۔خمریاتی ۲ ۔فلسفیانہ ۳ ۔طنزیہ

۴ ۔اخلاقی ۵ عاشقانہ ۶ ۔متصوفانہ

۷۔مدحیہ ۸۔مناجاتی ۹۔نعتیہ ۱۰۔منقبتی اور رثائیہ

جب ہم پنجاب کے فارسی ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ادباء کے علاوہ پنجاب کے حکمرانوں نے کافی حدتک فارسی ادب کی نشونما کی ہے۔ بہت سارے حکمران خود بھی شعروادب کے ساتھ وابستہ تھے۔انھوں نے ادب کی تخلیق کرنی شروع کی اوراپنے درباروں میں شعراء اورادیبوں کی قدردانی اور سرپرتی کی ۔حکمرانوں کے درباروں سے اعلیٰ درجہ کی شخصیتیں وابستہ تھیں ۔اورانہوں نے حکمرانوں کے ساتھ شاہانہ طریقہ کی زندگی بسر کی تھی اس رنگین ماحول سے فارسی ادب کو بہت اثر پڑا۔فن میں بہت حدتک بڑھاوا ملا۔اس کے علاوہ بادشاہوں کے محلات میں بہت رنگین محفلیں گرم رہیں ۔اہل عرب ہمیشہ ان محفلوں میں موجود ہوتے تھے ۔اس طرح کے گرم جوشی ماحول میں مشاعروں کوخمریات کہنا ایک رواج سا بن گیا۔وہ فطرت کے طور پرخمریات کو بیان کرتے تھے۔محلات کے رنگین اور پرکیف ماحول میں شراب ہمیشہ رہتا ہے ۔پنجاب کے فارسی شعراء نے رباعی کی صنف میں بھی جو فلسفیانہ اور اخلاقی موضوعات مناسب سمجھے ان موضوعات کوخمریات میں بیان کرنے کی کافی حدتک کوشش کی ۔مسعود سعد سلمان ،گرامی جالندھری ،محمد افضل سرخوش ،بوعلی شاہ قلندر جیسے شعراء نے خمریات طرز کی رباعیاں کہی ہیں۔ پنجاب کے رباعی گوشعراء نے اس سے بہت دلچسپی لی ہے چندرباعیات بطورنمونہ پیش کرنے کی سعادت کرتا ہوں ؛

اے ساقی جاں کہ سروسیم اندامی آرام دل حستہ بے آرامی

متاں تو امروز ہم مخموراند آخر بہ تو باز گرددایں بدنامی [11]

(کلام قلندری،ص۱۰۰)

گویا خبراز یادخدایافتہ ایم این جام لبالب از کجایافتہ ایم

جز طالب حق نصیب ہر کس نبود　　کیں دولت نایاب کہ ما یافتہ ایم[۱۲]

(تصنیفات گویا،۳۴)

در مشرب ما نہ ایں حلال است و حرام　　از جنت و نار ما نیائیم بدام

از ہر دو جہاں گذشتہ کردیم مقام　　آنجا کہ نہ کفر باشد و نے اسلام

☆☆☆

احمد چشم و چراغ ایام بود　　رونق افزائی بزم اسلام بود

روگشت اسا نشہ عرفان بکمال　　مستی افزون زآخرین جام بود[۱۳]

(دیوان سرخوش،٦٧)

فلسفیانہ رباعیات اور تصوفیانہ رباعیات:۔

تاریخ کے مطالعے کے بعد یہ بات ذہن نشین ہوتی ہے کہ فلسفہ اور تصوف رباعیات کا اہم موضوع رہا ہے۔فلسفیانہ نکات کی پیشکش کے لئے پنجاب کے فارسی رباعی گوشعراء نے اکثر انتخاب کیا ہے۔پنجاب کے شعراء نے زیادہ تر فلسفہ فنا،قناعت،عبادت،دنیا کی بے ثباتی موجودات عالم کے اعتبار محض اور زوال پذیر ہونے کا اپنی رباعیوں میں اکثر ذکر کیا ہے۔ان موضوعات سے پنجاب کے شعراء نے خاص دلچسپی کا اظہار کیا اور یہی موضوعات ان کی فلسفیانہ قصیدوں میں بار بار نظر آتے ہیں۔گرامی جالندھری کی فلسفیانہ رباعی پیش کرتا ہوں۔

دادند مرا برات غم من چہ کنم　　در دست دگر بود قلم من چہ کنم

دی آوردند موکشانم بوجود　　بردند امروز در عدم من چہ کنم

☆☆☆

آں رمز شناس بود و نابود نماند　　آں چاشنی رو داغ نمک سود نماند

بگسل ز دلاویزی ایں کہنہ رباط   برخیز، ایاز رفت، محمود نماند۱۴

(رباعیات گرامی،۱۶۳)

پنجاب کے فارسی گوشعراء کے کلام میں طنزیہ عنصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔اکثر جگہوں پر شاعروں نے طنزیہ طور کی رباعیوں کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔فطرت انسانی کائنات میں حسن کی جویا ہوتی ہے۔اور جہاں اس سے اسکے برخلاف صورت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔وہ اس کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی ہے۔طنز ایک طرح سے زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور اعلیٰ معیاروں کی عدم موجودگی کے احساس کا آفریدہ ہوتا ہے۔ہمیشہ طنز نگار کے ذہن میں دوسرے شخص کا معیار اور نصب العین موجود ہوتا ہے۔اسی کی بدولت اس کو روزمرہ زندگی کی کوتاہیوں ،کمزوریوں اور اس کی ناآسودگیوں کا احساس ستاتا ہے۔کہیں پنجاب کے شعراء نے سماجی حالات پر طنزیہ طریقہ اپنایا ہے۔کیونکہ اس وقت تھوڑا سا سماجی شعور اور بیداری پنجاب میں موجود تھا،طنزیہ رباعیوں کے ذریعے شعراء نے ہمیشہ سماج کو بہتر کرنے کی کوشش کی۔

اے پایہ بلند تر از افلاک   پابت کہ بریدہ شد چہ ہستی غم ناک

زیر قدمت بلندی و پستی ہست   پائے بہ فلک داری و پائے بر خاک

☆☆☆

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است   نظامش خام و کارش ناتمام است

غلام فقر آن گیتی پناہم   کہ در وسینش ملوکیت حرام است۱۵

(اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ،۲۰۰)

رباعیوں میں عام اخلاقی پستی پر طنز کیا گیا ہے علاقہ اقبال نے''ابنائے وطن''پر بہت سی رباعیاں بیان کی ہیں۔وہ بھی طنزیہ رباعیات سے معاشرہ کو اصلاح کرنے کی کوشش کرتے۔علاوہ ازیں علامہ اقبال نے زاہد کی ریاکاری کا پول کھولا ہے اور اس نے کئی جگہ بیان

کیا ہے کہ ایسا زاہد بیکار ہے جو محض ظاہر پرستی کے لئے اختیار کیا گیا ہو۔اس کا خیال ہے کہ ''زاہد'' کی خام کاری سے رندوں کی ''پختہ کاری'' سو درجہ بہتر ہے۔

خودی دادم ز خودمحرمے را　　　　کشادم درگل او زمرے را

بدہ آں نالہ گرمے کہ از وے　　　　بسوزم جز غم دیں ہر غمے را

☆☆☆

دریں بتخانہ دل باکس نہ بستم　　　　و لیکن از مقام خود گستم

زمن امروز می خواہد سجودے　　　　خداوندے کہ دی اورا شکستم

اخلاقی رباعیات:۔

اخلاق رباعی کا اہم موضوع ہے۔فارسی میں اخلاقی رباعیاں بکثرت ملتی ہیں۔ پند و موعظت اور اخلاق آموزی ابتدا سے ہی صنف رباعی میں موجود ہے، رباعی کی خمیر پہلے سے ہی اخلاقی نور سے منور تھی ،تاریخ شاہد ہے کہ فارسی ادب میں ابتداء سے ہی رباعیات کا اعلیٰ سرمایہ موجود ہے اس کا زیادہ ذخیرہ اخلاقی رباعیوں پر مشتمل ہے۔شاعروں نے پندوموعظت کی باتوں کو رباعی کے سانچے میں بہت خوش اسلوبی کے ساتھ ڈھالا تھا۔پنجاب کے فارسی شعراء کے سامنے رباعی کے اعلیٰ اور معیار والے نمونے موجود ہیں۔شعراء نے رباعی کے پیکر میں اخلاقی نکات پیش کر کے زندگی کی اعلیٰ قدروں کی اہمیت واضح کی ہے۔اور مقاصد کی بلندی ،انسانی سیرت کی عظمت اور کردار کی اصلاح کو خاص طور پر پیش کیا ہے۔صبر وقناعت ،حلم و بردباری ،استقلال ،سخاوت۔انکساری اور نیکی سے بول بالا کرنے کی تلقین کی ہے۔فارسی شعراء میں سرمدؔ ،ابوسعید ابوالخیرؔ ،سحابیؔ ،آملیؔ ،سنائیؔ ، عطارؔ ،رومیؔ ،سعدیؔ ،امیر خسروؔ، جامیؔ ،علامہ اقبالؔ ،گرامیؔ جالندھری ،سعد سلمانؔ ،سرخوشؔ سرہندی وغیرہ نے اخلاقی رباعیاں بڑے موثر انداز میں کہی ہیں۔پنجاب کے شعراء نے اپنے کلام میں اخلاق آموزی اور مقصدیت کو

بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے

ہر دل کہ براہ دوست جاناں شدہ است   تحقیق بداں کہ عین جاناں شدہ است

یک ذرہ زفیض رحمتش خالی نیست   نقاش درونِ نقشِ پنہان شدہ است [16]

(دیوانِ گویا،ص۳۲)

ہر چند سخن سراو موزون باشی   انسان بے علم معرفت چون باشی

ترجیع از نطق بردوابست تراہ   یکہ پایہ زچاہ پایہ افرزون باشی [17]

(کلمات الشعراء،ص۱۳۴)

ای ہیچ بہ ہیچ خودنمائی تاچند   خودبینی وخویشتن سنائی تاچند

چون می دانی کہ جز کف خاک نہ   پس این ہمہ دعوی خدائی تاچند

عاشقانہ رباعی:۔ عاشقانہ رباعیوں کی تعداد پنجاب کے فارسی ادب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔اس طرح کا سرمایہ یہاں کے ادب میں بہت نظر آتا ہے۔فارسی رباعیاں اپنے اندر ایک خاص مٹھاس اور جاذبیت رکھتی ہیں۔موجودہ دور میں رباعی میں عاشقانہ جذبات اور لطیف احساسات کوسمویا جارہا ہے۔اس سلسلے میں خاص طور پر علامہ اقبالؔ ،ناصر علیؔ سرہندی ،بوعلی شاہ قلندؔر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہے۔اقبالؔ اور سرخوشؔ کی رباعیوں میں جوشگفتگی ،نکھار ،رنگینی اور شیرینی نظر آتی ہے۔وہ قدیم شعراء کی پر کیف اور شگفتہ رباعیوں کی یادتازہ کردیتی ہے۔بعض نقادوں کے خیال میں رباعی محض اخلاقی یا متصوفانہ تصورات وغیرہ کے لئے مختص ہے اس میں حسن وعشق کی داستانوں اور گل وبلبل کے افسانوں کی گنجائش نہیں ہے۔پنجاب کے فارسی ادب میں ابتداء سے ہی عاشقانہ رباعیات کا اعلیٰ ذخیرہ نظر آتا ہے مسعود سعد سلمان ،علامہ اقبال، برہمن لاہوری اور بوعلی شاہ قلندر کی رباعیات اس پہلو کے بہترین ثبوت ہے۔یہاں کے فارسی شعراء نے جذبات وواردات عشق کی بڑی موثر تصویریں رباعیات میں

پیش کی ہیں ۔عشق کی گوناگوں کیفیات کی دلفریب مصوری نے فارسی رباعیات میں رنگینی ،شادابی اوردلکشی پیدا کردی ہے۔رباعیات میں ہجر کی تنہایوں کی کسک کوبھی بیان کیا ہے۔اور قرب کا نشہ بھی ۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فارسی رباعی ،غزل سے بڑی حد تک اثر پذیر ہوئی ہے۔یہاں کے فارسی ادب کی نشونما اکثر شاہی درباروں اورامرا کی رنگین محفلوں میں ہوئی ہے ۔ان رنگین محفلوں کوشان وشوکت دینے کے لئے امراء نے اکثر عاشقانہ موضوعات کی فرمایش کی تھی۔ بوعلی قلندر کی عاشقانہ رباعی پیش کرتا ہوں۔

گر دررہ عشق می نمائی تگ وتار　　باشی بہ خیال خویش درراز ونیاز

معشوق پرست خود پرستی نکند　　کو عشق حقیقی و کجا عشق مجاز

اگرلب رخسار کی شکایتیں سنا تا ہے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں معلوم ہوتی ۔اس وقت سارے ماحول پرعیش وعشرت کی فراوانی کی وجہ سے بدقسمتی چھائی ہوئی تھی ۔اور زندگی کی رنگینوں میں ڈوب جانا ہی مقصد حیات سمجھا جاتا تھا۔بادشاہوں نے دل کھول کر دادعیش دی تھی ۔اوران کے دربار سے متوسل شعراء کا ذہنی میلان بھی زندگی کے رنگین اور پرلطف پہلووں کی طرف زیادہ تھا۔اوراس دور کا پوراادب متاثرنظر آتا ہے۔پنجاب کے فارسی شعراء کی رنگینی و زندہ دلی کہیں کہیں ان کی رباعیوں میں عریانی کی حدوں کوبھی چھولیتی ہے۔فارسی شعراء کی چند عشقیہ رباعیاں ملاحظہ ہوں ۔

جہاں ازعشق وعشق ازسینہ تست　　سرورش ازمے دیرنہ تست

جزایں چیزے نمیدانم زجبریل　　کہ او یک جوہراز آئینہ تست

☆☆☆

بجلوت نےنوازی ہاے من بیں　　بخلوت خودگزاری ہاے من بیں

گرفتم نکتہ فقر از نیاگاں زسلطاں بے نیازی ہاے من بیں ۱۸؎

(ارمغان حجاز، ص ۱۵۵)

آوارہ عشق من قا ہر خانہ رسید درد دل من بہ خویش و بیگانہ رسید

اندر غم عشق تو بہر جا کہ روم ز دور پند کہ دیوانہ رسید ۱۹؎

(دیوان بوعلی قلندر۔ص،۱۴۹)

مذہبی رباعیاں:۔ جہاں تک ادب کی تاریخ کا سوال ہے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کی ادبی تخلیقات مذہبی اغراض و مقاصد کے تحت وجود میں آئی تھیں ۔ پنجاب میں فارسی ادب کی نشو نما میں صوفیانہ اور اولیاء اللہ کا بڑا ہاتھ رہا ہے ۔صوفیوں نے تصوف کے اسرار و رموز کو عام فہم اور سیدھی سادی زبان میں پیش کیا تھا پنجاب کے ادب کی تمام اصناف سخن میں تصوف کی جھلک موجود ہے۔ پنجاب کے شعراء نے اس ڈھنگ کو کبھی فراموش نہیں کیا۔انھوں نے روایتی مضامین کو ہمیشہ اپنانے کی کوشش وجدوجہد کی تھی مسعود سعد سلمانؔ سے لے کر بوعلی قلندر، چندر بھان بہمن، گرامیؔ جالندھری اور علامہ اقبال، کرپال سنگھ بیدارؔ کے دور تک رباعی میں تصوف کی چاشنی موجود رہی ہے ۔اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ تصوف نے حب دنیا، حرص وطمع ،خودغرضی اور ریاکاری جیسی بدبختانہ انسانی کمزوریوں کے خلاف آواز بلند کی اور ان کو دور کرنے کی کافی حد تک سعی کی تھی ۔مولانا عبدالسلام سندیلوی نے ''شعراءالہند'' میں تصوف کے مضامین پر مفصل روشنی ڈالی ہے اور اس کے خاص موضوعات، واحدالوجود، تجلیات الٰہی کی بو قلمونی، نمود بے نمود مشاہد الٰہی، اخصائے الٰہی، طہارت نفس، تحفظ نفس، ضبط نفس، تذکیہ قلب، مقامات سلوک مراقبیہ اور مقام فنا وغیرہ کا ذکر کیا ہے ۔ یہ وہ خاص مضامین ہے جس کے ذکر سے باب رباعیات خالی نہیں ہیں ۔ان مضامین کے مختلف پہلوؤں کا عکس پنجاب کے شعراء کی رباعیات میں موجود ہے۔

بآن رازے کہ گفتم ، پے نبردند | زشاخ نخل من خدمانخوردند
من ایخ میرامم داد ازتو خواہم | مرایاراں غزلخوانے شمردند
گلستانے زخاک من برانگیز | نم چشمم بخون لالہ آمیز
بہ دور فتنہ عصر کہن ،او | بہ دورفتنہ عصروراں ،من ۲۰

(ارمغان حجاز ،ص ۱۵۷)

اے آنکہ زیورتو دوعالم روتن | پنہاں تو بہ عالمے چوجان اندرتن
ما منتظر جمال وحدت یاشیم | پس پردہ کثرت از رخ خویش فگن ۲۱

(دیوان بوعلی قلندر ۔ص ،۱۴۸)

ماہ چہ روشنی کہ درروئے تو نیست | درخلد چہ خرمی کہ درکوئے تو نیست
مشک ختن چوزلف خوشبوئے تو نیست | یکسر ہنری عیب تو جہیز خوئے تو نیست ۲۲

(مسعودسعید ۔اردورباعی ،ص ،۱۴۴)

رابیست عبدتاحضور اللہ | خواہی تو درازگیرخواہی کوتاہ
ایں کوثر وطوبیٰ کہ نشانہا دارد | سرچشمہ سایہ ایست دریں ہمہ راہ ۲۳

(رباعیات حالی ،ص ،۱۵۴)

پنجاب کے شعراء نے مدحیہ رباعیاں بھی کہی ہیں اکثر شاعروں نے مدحیہ رباعیات میں باد شاہوں کے تعریف کی ہے ۔جس طرح مسعودسعدسلمان نے سلطان ابراہیم کی تعریف کی ہیں ۔

سلطان ملک است دردل سلطان نور | ہروزکند بروی اوسلطان سور
ہرگز ندود برود برسلطان زود | چشم بدخلق آرداز سلطان دور
دردولت شاہ چون قوی شدرایم | گفتم کہ رکاب رازز د فرایم

زر گفت مرا کہ من ترا کی شایم   آمد آہن گرفت ہر دو پایم ۲۴؎

(دیوان مسعود سعد سلمان، ص ۷۰۵)

پنجاب کے فارسی ادب کے رباعیوں میں مناجاتی رنگ بہت نظر آتا ہے۔مناجاتی رباعیوں میں شعراء نے خدا سے دعا مانگی ہے مناجاتی رباعیاں ابتدائی دور سے لے کر آج تک کہی جاتی رہی ہیں۔شعراء نے نیک ہدایت حاصل کرنے اور سیدھے راستے پر گامزن رہنے کی دعا مانگی ہے۔کبھی افلاس ونکبت سے محفوظ رہنے اور کبھی اعلیٰ روحانی درجنوں تک پہنچنے کی پر خلوص آرزو کا اظہار کیا ہے چند مناجاتی رباعیاں پنجاب کے فارسی ادب سے لی جاتی ہے۔شعراء نے رباعی میں حمد خدا کے مضامین بھی باندھے ہیں نمونہ کے طور پر مسعود سعد سلمان کی رباعی پیش کرتا ہوں۔

ای کلک ملک وصف تو گویم ہمہ سال   وزطبع کل مدح تو بویم ہمہ سال

سرخ است بدولت تو دولیم ہمہ سال   روزی زخدای وزتو جویم ہمہ سال

☆☆☆

ای بدر شدہ من از غمان تو ہلال   ای صورت حسن من زعشق تو خیال

گر ہیچ مرادست دہد با تو وصال   بر فرق فلک نشینم از عزوجلال ۲۵؎

(دیوان مسعود سعد، ص ۷۰۴)

مذہبی رباعیوں میں نعتیہ رنگ اکثر نظر آتا ہے اس کے علاوہ منقبت کے انداز میں بھی بہت سی رباعیاں کہی گئی ہیں ان میں حضرت محمدﷺ، علیؑ، حسنینؑ، حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ اور بزرگان دین مثلاً خواجہ بندہ نواز خواجہ محی الدین چستی اور بابا فرید وغیرہ کی مدح کی گئی ہے۔نعتیہ رباعیوں میں شعراء نے کوئی جدت پیدا نہیں کی ہے۔البتہ منقبتی رباعیوں میں کہیں کہیں انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔نعتیہ رباعیوں میں پنجاب شعراء نے خاتم النبین کی سرکار میں

نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ناصر علی سرہندی کی رباعی جو حضرت محمدﷺ کے بارے میں کہی۔حسب ذیل پیش کرتا ہوں۔

تا چند ز دوری تو آزار کشم　　در وصل ہم انتظار دیدار کشم

نیرنگ جمال او جہانی دارد　　تصویر کدام صورت یار کشم

رثائی رباعیاں:۔رثائی رباعیاں زیادہ تر مرثیہ گو شعراء نے کہی ہیں۔اگر چہ ان سے قبل بعض شعراء کے یہاں اس قسم کی کچھ رباعیات ملتی ہیں۔لیکن مرثیہ گو شعراء نے رثائی رباعیاں خاص طور سے نظم کی ہیں۔پنجاب میں رباعی گوئی میں رثائی مضامین زیادہ تر علامہ اقبال، بوعلی شاہ قلندر، مسعود سعد سلمان، گرامیؔ، ناصر علیؔ وغیرہ نے نظم کیں ہیں۔سرخوشؔ سرہندی کو رسول اکرم اور اہل خانوادہ کے ساتھ خاص عقیدت تھی۔نمونہ کے طور پر سرخوش کی یہ رباعی پیش کرتا ہوں۔

کردند چون کوفیان سوی شام روان　　بر نیزہ سر حسین شاہد و جہان

لرزید فلک کہ شد قیامت بر پا　　یک نیزہ بر آمد آفتاب تابان ۲۶

(کلمات الشعراء، ص ۱۳۱)

غمہای تو از راندان خونہا کارم　　خود نیست چرا راندن خونہا کارم

در دیدہ من از مرگ تو خونہا دارم　　بر مرگ تو تا بمرگ خونہا بارم ۲۷

(دیوان مسعود، ۷۰۵)

بدہ او را جوان پاکبازے　　سرورش از شراب خانہ سازے

قوی بازوے او مانند حیدرؓ　　دل او از دو گیتی بے نیازے ۲۸

(علامہ اقبال، ارمغان حجاز، ص ۱۵۷)

فارسی شاعری میں عورت کے جذبات اور عشق کا اظہار بھی کیا جاتا ہے اور اس کا

مخاطب مرد ہوتا ہے۔ پنجاب کے شاعروں نے بھی جوش و جذبات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور صیغہ تانیست سے کام لیا ہے۔ رباعیوں میں اس طرح کی مثالیں بہت سارے شعراء نے پیش کی ہیں۔ ہر زبان میں تقریباً شعراء نے عشق و محبت کے اظہار کے لئے نرم، سبک، دلکش اور لطیف پرایہ بیان کئے ہیں۔ اور جب یہ نرم، شیرین اور پر اثر لب و لہجے میں ڈھلتے ہیں۔ تو شعراء اپنے حسن اور بانکپن کو زیادہ اجاگر کرتے ہیں۔ فارسی رباعیوں میں جو رنگینی، رس اور لطافت ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بابر، ہمایوں اور اکبر کو فارسی شاعری کے ساتھ خاص وابستگی رہی ہے وہ فارسی شاعری کے ذریعے داستان عشق سنے کے عادی تھے۔ اس کے علاوہ رباعیات میں بڑی خوبصورت دلنشین تشبیہات اور استعارے استعمال کئے ہیں ان میں دکنی تہذیب کا عکس نظر آتا ہے یہ تشبیہات کہیں محض شعر کے حسن میں اضافہ کرنے کے لئے استعمال ہوئی ہیں، تو کہیں معنیٰ کو وسعت دینے کے ئے شعراء نے پرکشش تشبیہات کے ذریعے سے اپنی رباعیوں کی شگفتگی اور رعنائی کو ایک منفرد انداز بخشا ہے۔

رباعیوں کے ردیفوں اور قافیوں میں اکثر و بیشتر خالص فارسی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ رباعی گو شعراء نے بہت جگہ پر مشکل ردیفیں بھی اپنی رباعیوں میں استعمال کئیں ہیں۔ جن سے ان کی قدرت کلام اور اپنے محدود لفظی خزانے کو خوش اسلوبی کے ساتھ برتنے کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حالانکہ صنف رباعی میں بحروں کا استعمال آسان نہیں ایک ایسے دور میں جب کوئی بھی زبان بچپن کے عہد میں ہو اس وقت زیادہ ہی سخت کام بن جاتا ہے۔ رباعی گو شاعر کے لئے پہلے تو یہ دشوار ہے کہ پورے مضمون کو چار مصرعوں میں ادا کرنا پڑھتا ہے بعد میں علم عروض کا خاص پابند رہنا پڑھتا ہے۔ اس امتحان میں وہی شعراء کامیاب ہوسکتے ہیں جن کو زبان اور بلاغت پر پورا دسترس حاصل ہو۔

مختصر رباعیوں میں کہیں کہیں روزمرہ اور ضرب الامثال کو بھی سلیقے کے ساتھ برتا گیا ہے۔ یہ

ایسی ضرب الامثال ہیں جو زیادہ تر پنجاب کے رباعی گوشعراء نے استعمال کئے ہیں ۔کیونکہ یہاں کے شعراء ضرب الامثال کے ذریعے سے اپنے کلچر کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔اور سماج کے طرز وتمدن پر انداز فکر ہورہی ہے۔ذیل میں ایسی رباعی درج ہیں جن میں ضرب الامثال کو جگہ دی گئی ہیں۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر   روزِ محشر عذر ہائے من پذیر

گر تو می بینی حسابم ناگزیر   از نگاہ مصطفےٰ پنہاں بگیر

(کلامِ اقبال)

حوالہ جات

۱۔ قواعد العروض، سید غلام حسین قدر بلگرامی، اودھ ہلال نمائے عید، ۱۲۸۸ھ، ص ۱۷

۲۔ بحر الفصاحت، حکیم نجم الغنی رامپوری، نولکشور پریس لکھنوء، ۱۹۲۶، ص ۱۰

۳۔ ایضاً، ص ۲۷۵، (۴) ایضاً، ص ۴۴۵

۵۔ المعجم فی معائر اشعار العجم، شمس الدین محمد بن قیس رازی، کاشغر لیکہ آباء لیوعین، بیروت، ۱۹۰۹ء، ص ۶۷۲

۶۔ اردو رباعیات، سلام سندیلوی، نسیم بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۸۰

۷۔ رباعیات سرمد، سرمدؔ، اردو معلیٰ بک ڈپو، دہلی، ۱۳۶۰ھ، ص ۵۵۶

۸۔ غیاث الغات، غیاث الدین، مطبع حسینی میر حسن رضوی، ۱۲۶۵ھ، ص ۲۱۷

۹۔ تنقید شعر العجم، پروفیسر محمود شیرانی، انجمن ترقی اردو دہلی، ۱۹۴۲ء، ص ۵۶۲

۱۰۔ العروض القوافی، جلال الدین احمد جعفری، ص ۶۵

۱۱۔ کلام قلندری، بوعلی شاہ قلندر، مطبع جٹ پرشاد، میرٹھ، ۱۸۹۰ء، ص ۱۰۰

۱۲۔ تصنیفات گویا، مہاں سنگھ، خالصہ ٹرسٹ امرتسر، ص ۳۴

۱۳۔ دیوان سرخوش، ڈاکٹر شبیر احمد، کتابستان چندوارہ، مظفر پور، ص ۶۷

۱۴۔ رباعیات گرامی، شیخ غلام قادر، شیخ مبارک تاجر کتب، لاہور، ۱۹۱۵ء، ص ۱۶۳

۱۵۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۰۰

۱۶۔ دیوان گویا، نندلال گویا، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، ۱۹۷۳ء،

۱۷۔ کلمات الشعراء، محمد افضل سرخوش، مدراس یونیورسٹی، ۱۹۵۱ء، ص ۱۳۴

۱۸۔ ارمغان حجاز، ڈاکٹر محمد اقبال، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۲۸ء، ص ۱۵۵

۱۹۔ دیوان بوعلی، بوعلی شاہ قلندر، خدا بخش لائبریری پٹنہ، ۱۸۰۰ء، ص ۱۴۹

۲۰۔ ارمغان حجاز، ڈاکٹر محمد اقبال، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۲۸ء، ص ۱۵۷

۲۱۔ دیوان بوعلی، بوعلی شاہ قلندر، خدا بخش لائبریری پٹنہ، ۱۸۰۰ء، ص ۱۴۸

۲۲ اردو رباعی، مسعود سعید، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، ص ۱۴۴

۲۳ رباعیات حالی، حالؔی، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ، ۱۹۳۰ء، ص ۱۵۴

۲۴ دیوان مسعود سعد، رشید یاسمی، دانشگاہ تہران، ۱۳۱۸ھ، ص ۷۰۵

۲۵ ایضاً، ص ۷۰۴

۲۶ کلمات الشعراء، محمد افضل سرخوش، مدراس یونیورسٹی، ۱۹۵۱ء، ص ۱۳۱

۲۷ دیوان مسعود سعد، رشید یاسمی، دانشگاہ تہران، ۱۳۱۸ء، ص ۷۰۵

۲۸ ارمغان حجاز، ڈاکٹر محمد اقبال، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۲۸ء، ص ۱۵۷

باب چہارم:

پنجاب کے اہم فارسی رباعی گوشعراء

مسعود سعد سلمانؔ

اصلی نام مسعود سعد اور تخلص سلمانؔ استعمال کرتے تھے۔اس نامور شاعر کی فنکارنہ حیثیت سے ہندوستان میں فارسی شاعری کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جن کے بارے میں ہم زیادہ نہیں جانتے لیکن اپنے عہد کے درجہ اول کے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔مسعود سعد کو اپنے ہم عصر شعراء بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔مسعود سعد سلمانؔ ۴۳۸ھ سے ۴۴۰ھ کے درمیان لاہور میں پیدا ہوئے۔مسعود کے ولادت کے بارے میں علامہ قزوینی کے خیالات مندرجہ ذیل ہیں:۔

''اصل مسعود سعد از ہمدان است، نیا کانش درزمانی کہ آواز
شوکت دولت غزنوی برخاست بہ غزنین آوردہ ملک عمال
آن دولت منتظم گشتند''۱؎

(دیوان مسعود،ص ۱۱)

مسعود سعد سلمانؔ کے باپ نے ساٹھ سال تک غزنویوں کی ملازمت کی،جس کے بارے میں دیوان مسعود سعد میں اشعار یوں موجود ہیں:۔

شصت سال تمام خدمت کرد　　پدر بندہ سعد بن سلمان
گہ باعراف بودی از عمال　　کہ بدرگاہ بودی ازعیان۲؎

(دیوان۔ص ۱۱)

مسعود سعد سلمان ایک ذہین اور مشہور خاندان سے تعلق رکھتا تھا،اپنے اسلاف کی برتری پرفخر کرتے ہوئے یوں کہتا ہے۔

گرچہ اسلافِ من بزرگانند　　ہریک اندر ہنر ہمہ استاد
نسبت از خویشتن کنم چو گہر　　نہ چوخاکسترم کز آتش زاد

کچھ صاحبانِ تذکرہ یعنی لباب الالباب کے مصنف عوفی،تقی اوحدی اور امین رازی مسعود سعد سلمانؔ کو ہمدانی جانتے ہیں،لیکن مسعود سعد سلمانؔ نے خود اپنے پیدائش کے بارے میں ذکر کیا ہے۔کہ میرے جد واجداد ہمدان کے رہنے والے تھے میں لاہور میں پیدا ہوا۔ابو طالب

تبریزی خلاصہ افکار اور غلام علی آزاد سبحۃ المرجان میں یوں ذکر کرتے ہیں۔

''مسعود خود ہمدان قصیدہ سابق الذکر گوید۔

بہ ہیچ نوع کہ ناہی دگر نمید انم   مرا جزاینکہ درین شہر مولد و من شاست'' ۳؎

(دیوان، مسعود، ص۹۳)

بہرحال اس بات پر سارے متفق ہیں کہ مسعود سعد سلمانؔ کی ولادت لاہور میں ہوئی۔ ان کی عمر کا زیادہ تر حصہ مصیبت و پریشانی میں گزرا۔ عمر عزیز کے تقریباً ۱۹ سال قید خانوں میں گزارنے پڑے۔ مسعود سعد سلمانؔ مسعود ابراہیم کے دربار سے وابستہ تھے۔ ۳۹ قصیدے اس کے شان میں کہے۔ دیوان میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

خجستہ بادت نوروز واین چنین نوروز   ہزار حفت شد بامہ رجب دریاب ۔۴؎

(دیوان، ص۱۸)

ہندوستان آنے کے بعد سلطان ابراہیم کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ اسی وقت سے مسعود نے شاعری پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ ابوالفرج رونؔی کی بدولت مسعود کی رسائی سلطان ابرہیم مسعود کے دربار میں ہوئی۔ اس سفارش کے بارے میں ابوالفرج کے اشعار مسعود کے دیوان اس طرح موجود ہے۔

خسروا بندہ را دراین دوسہ سال   درمدیح تو شعر ہاست متین

ہر یکی کردہ ناشدی انشاد   در سنہ اربعہ ماۂ و متین

مسعود سعد سلمانؔ نے بہترین شاعری سلطان ابراہیم کے شان میں لکھی۔ ایک دن سلطان اور اس کے بیٹے کے درمیان ان بن ہوگئی تھی تو صیف الدولہ نے دونوں مسعود اور اپنے باپ کو قید کر لیا۔ اس وقت گرفتاری پر مسعود سعد سلمانؔ نے یہ شعر قلم بند کیا۔

نظم ونثر کسی را گرافتخارِ سزاست   مراسزا است کہ امروز نظم ونثر مراست ۔۵؎

(دیوانِ مسعود، ص، ۱۸)

مسعود سعد سلمانؔ کو سات سال قلعہ سو اور دھک میں گزارنے پڑے تھے۔ مزید تین سال قلعہ نای میں گذارے۔ اس دوران مسعود سعد سلمانؔ سلطان اور امرائے غزنین کے

بارے میں بہت تنقیدی قصائد تحریر کیں ہیں۔مسعود سعد سلمانؔ نے جوانی کا عہد سیف الدولہ کے دربار میں گذارا۔مسعود سعد اورابوالفرج کے اشعار نہ ہوتے تو ہمیں محمود کے جنگوں کے بارے میں معلومات نہ ملتی۔مسعود سعد سلمانؔ نے فوج کی سرداری اورلذت اماری کے بارے میں شاعری میں خوب ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ ردیف ورمز کا شاعری میں خوب استعمال کیا ہے۔اگرچہ مسعود کے دیوان میں قصیدے زیادہ ملتے ہیں لیکن رباعی گوئی میں بھی شاعرنے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔اس کے دیوان میں بے حد رباعیاں موجود ہیں۔رباعیوں کے ذریعے انہوں نے اپنے زندگی کی درد بھری کہانیوں کو پیش کیا ہے۔رباعی گوئی کے سلسے میں مسعود سعد نے سنائی ،راشدی اوررودکی کے کلام کی پیروی کی۔مسعود سعد کا کلام سادہ اور روان ہے۔قدرت فکر اور جدت تراکیب اس کے کلام کی نمایاں خوبی ہیں۔اس رباعی سے رباعیات کا باب دیوان میں شروع کردیا۔یہ رباعی پنجاب کے رباعیات کے حوالے سے تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔کیونکہ مسعود سعد کے دور سے ہی رباعی گوئی کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے۔

گرچہ فلک ازپیش براندہ است مرا　　　بابندگران فرو نشاندہ است مرا

تادولت ازدور سراندہ است مرا　　　جزروی تو آرزو نماندہ است مر۔۶ے

(دیوان،ص،۶۸۰)

سیدسلیمان ندوی کے مطابق جب مسعود سعد کو قید کردیا گیا۔تو اس وقت ان کے سرکا ایک بھی موسفید نہیں تھا،لیکن جب قید سے رہا ہوئے اس وقت سعد سلمانؔ کا ایک بال بھی سیاہ نہیں تھا۔رہائی کے بعد مسعود سعد سلمانؔ کو شاہی کتب خانہ کا منتظم مقرر کیا گیا،اسی دوران انھوں نے اپنا فارسی کلام مرتب کردیا۔جس کورشید یاسمی نے ایران سے شائع کردیا تھا۔مسعود سعد نے تقریباً ہر اصناف پرطبع ازمائی کی ۔رباعیات میں بھی انہوں نے خوب نام کمایا تھا۔مسعود سعد سلمانؔ کے فارسی کلام کوزیادہ اہمیت اس لیے حاصل ہے کیونکہ ہندوستان کے پہلے فارسی شاعر کی حیثیت سے گزرے تھے،ان کا کلام تاریخی نقطہ نظر سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔سلیمان ندوی صاحب نے اپنی کتاب ''ردو رباعیات'' میں مسعود سعد سلمانؔ کی دو رباعیوں کوقلم بند کیا ہے۔

در آرزوی بوی گل تو روزم　　　　در حسرت آن نگار عالم سوزم

از شمع سہ گونہ کاری آموزم　　　　می گویم و می گذارم و می سوزم

☆☆☆

در ماہ چہ روشنی کہ در روی تو نیست　　　　در خلد چہ خرمی کہ بوی تو نیست

مشک ختن چو زلف خوشبوی تو نیست　　　　یکسر ہنری عیب تو جز خوی تو نیست ۔ ۷

(اردو رباعیات، ص ۱۴۵)

مسعود سعد سلمان نے جو سال قید خانوں میں گذارے، ان تلخ یادوں کو بڑے موثر انداز سے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ حبسیہ مضامین پر زیادہ زور صرف کیا ہے۔ اس کے درد واثر میں ڈوبے ہوئے دلدوز شعر پڑھنے والے پر رقت طاری کر دیتے ہیں۔ مثلاً

ہر روز ہمی فلک بہ تیری زندم　　　　پیراہن درسیاہ تیری زندم

وین بخت ہمی ہیچو اسیری زندم　　　　از وی سیری خواہم تیری زندم

جان ہر ساعت ز کارِ زاری دیدم　　　　ہر روز زمانہ بیش کاری دیدم

از بخت گلی خواہم و قاری دیدم　　　　باشد روزی کہ روزگار دیدم

☆☆☆

از عشق تو در چشم خرد میل زدم　　　　پس دست بہ تسبیح و بہ تہلیل زدم

بر وقت تو چو طبل تحویل زدم　　　　من دست بجای جامہ بر نیل زدم ۔ ۸

(دیوان، ص ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸)

مسعود سعد سلمان کو ابوالفرج رونی کی طرح طویل بحروں اور لمبی ردیفوں کا شوق نہیں ہے۔ اس کے کلام میں احساس قرب نظر آتا ہے۔ اس کی رباعیات میں مدحیہ اور عشقیہ مضامین بھی ملتے ہیں۔ لاہور سے دور اس کی یاد میں فرزند لاہور نے آنسوں کے جو موتی بہائے۔ ان موتیوں سے شاعر نے شاہکار اشعار کہیں۔ فارسی ادب میں مسعود سعد کا شمار ان نامور شعراء میں ہوتا ہے جن کے شاعری میں مقامی اثرات ملتے ہیں۔ عوفی لباب الالباب کے مصنف کے مطابق مسعود سعد سلمان نے تین دیوان فارسی، ہندی، عربی مرتب کیے ہیں۔ عربی دیوان

کے متفرق اشعار ملتے ہیں لیکن ہندی دیوان نایاب ہوگیا ہے۔ ہندی کا اثر مسعود کے کلام میں موجود ہے اور لاہور کے آب وہوا میں پلا پوسا تو مسعود کا ہندی میں شعر کہنا بعید از امکان معلوم نہیں ہوتا ہے۔ مسعود سعد سلمانؔ ایک رباعی میں اپنے تعریف یوں کرتے ہیں۔

من نم کاندر عجم واندر عرب کی نہ بیند چوں من از چہرہ زبانی

سجود آرد بہ پیش خاطر من روان رودکی وابن ھانی۔9

(دیوان،۲۰)

اس کے علاوہ مسعود سعد نے اپنے دیوان میں ایک رباعی نصراللہ بن عبدالحمید کے نام لکھی۔ جو مندرجہ ذیل پیش کرتا ہوں۔

ایشاہ بترس از آنکہ پرسنداز تو جائی کہ تو دانی کہ نترسنداز تو

خرسند نہ بپادشاہی زخدای پس چون باشم بندخرسند از تو۔10

(دیوان،ص۷۲۱)

مسعود سعد سلمانؔ بلند پایہ کا شاعر تھا۔ اپنے ہمعصروں کے ساتھ میں زیادہ ابوالفرج کے ساتھ تعلوقات تھے۔ ان کی شاعرانہ استعداد اور قابلیت ان کے کلام میں بہ خوبی نظر آتی ہیں۔ مسعود سخن سنج اور نکتہ شناس شاعر تھے۔ ان کے کلام میں الفاظ کی برجستگی اور معانی کی بلندی خوب ہے۔ مسعود سعد کی شاعرانہ خوبی مندرجہ ذیل اشعار سے معلوم ہوتی ہیں۔

از شیرینی چون بسخن بنیشنی از دولب خود شکر بدامن چینی

در بوسہ لب تو گویدم می بینی ہرگز شکر سرخ ندین شیرینی

☆☆☆

با من بمیان رسول باید با تو خورشید نخواہم کہ برآید با تو

آتی بر من سایہ نیابد با تو شاید ہمہ خلق و من شاید با تو۔11

(دیوان،ص،۷۲۱)

گفتی خبرت کنم کسی بفرستم با دل گفتم زاندہ دل رستم

من دل ہمہ بر وعدہ خوبت ہستم شادم کن اگر سزای شادی ہستم

مسعود سعد سلمانؔ نے سلطان محمود کے دربار میں رسائی حاصل کر کے بہت سے قصیدے اس کی شان میں قلم بند کیے ہیں۔قصیدے میں زیادہ تشبیب کا استعمال کیا ہے۔مسعود نے پہلے قصیدوں میں اپنی پریشانیوں اور محرومیوں کو کمال بیچارگی کے ساتھ پیش کیا۔مسعود سعد نے اپنے ممدوح کی مدح سرائی میں قصیدے کی مدحیہ شراط کو بڑی ہنرمندی اور چابکدستی سے پورا کرتے ہیں۔مسعود سعد سلمانؔ اپنے دل کو تسکین کے لیے اپنے اشعاروں میں آسمان سے شکوہ وشکایت زمانے کی کج ادائی،حاسدوں کی حسد اور اپنے کلام کی ناقدری کا شکوہ کمال خوبی سے کرتے ہیں۔قصائد کے ساتھ ساتھ رباعی گوئی میں مسعود سعد نے بہت نام کمایا ہے۔اپنے رباعیوں میں فلسفیانہ مضامین اور دقیق علمی مطالب سے گریز نہیں کیا ہے۔اپنے عہد کے مشہور رباعی گوشعراء میں شمار ہوتے ہیں۔بے حد سخن شناس اور نکتہ سنج شخص تھے۔فارسی شعروشاعری پر بہت دسترس رکھتے تھے۔رباعی لکھنے میں انہوں قدماء کی طرز سے انحراف کیا ہے۔کیونکہ اکثر مسعود سعد نے جیلوں میں زندگی گذاری تھی اور وہی اثر ان کی شاعری پر پڑھ گیا۔ردیف ورمز کا خاص خیال رکھتے تھے۔مسعود سعد سلمانؔ نے معنی آفرینی اور لفظی مناسبت کی خوبی کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ اس کی اخلاقی خوبیاں،علم پروری،جود وسخاء،رحم وکرم،شجاعت وبہادری اور عدل ودانش کی صفات کو دلکش طرز میں بیان کیا ہے۔مثلاً چند رباعیاں پیش کرتا ہوں۔

این چرخ بسی بدل کند نو ھارا　　　بدخوست از آن بدل کند خوھارا
ہم ریت کند بطیع نیکوھا　　　ہم ضعف دھد بقہر نیرو ھارا

☆☆☆

ای تن تو بطیع بار میمار کشی　　　خوشدل خواشدل رنج وغم یار کشی
از چرخ ہمی بلای بسیار کشی　　　خوش برتو تہد باکہ خوش بار کشی

☆☆☆

ای شاہ جہاں زملک باقی شادی　　　زیرا کہ برای ملک باقی زادی
سلطانی راجمال باقی دادی　　　سلطان سلاطینی باقی دادی

مسعود کے اشعار کی خوبی آشکار ہے۔ اول تو یہ اشعار تبعیت فطرت سے خبر دیتا ہے، دوم مسعود کے مضمون شعر میں نمکینی، شوخی اور مٹھاس ایسی ہے کہ دل یہی چاہتا ہے کہ سو بار اس شعر کو پڑھ لوں۔ علاوہ ازاین اس کے شعر کا بڑا حسن یہ ہے کہ پردہ نشینوں کو پردہ وار کر کے دکھاتا ہے۔ مسعود کے اشعاروں میں مضمون آفرینی بہت نظر آتی ہے۔ حکمت وفلسفہ سے ان کی شاعری لبیریز ہے۔ مسعود کی شاعری کا ہر مصراعہ تصویر عبرت ہے۔ فصیح سے فصیح اور بلیغ سے بلیغ واعظہ بھی اس سے بہتر طریقہ اختیار نہیں کرسکتا۔ اگر دنیا دار شخص بھی اس کی شاعری کو پڑے تو یکدم ان کے آنکھوں میں دنیا ہیچ دکھائی دیے گا۔ اور یقیناً اس کو دنیا سے نفرت ہو جائے گئی۔ رباعیوں کے سے مسعود نے دنیا کی ناپیداری پر بہت نصیحت کی۔

دانی تو کہ بابند گرانم یارب   دانی کہ ضعف دنا توانم یارب
شد درغم لوہودروانم یارب   یارب کہ درآرزوی آنم یارب

☆☆☆

کس نتواند زبد رھانید مرا   زیرا ثقلۃ الملک برانید مرا
ازرنج عدوبازرھانیدمرا   وزخاک برآسمان اسانیدمرا

وقت کے حکمراں بھی مسعود پر ناز کرتے تھے۔ ایک دن بہرام شاہ کو دربار میں کچھ مہمان آئے تھے۔ اُسی دوران مسعود سعد میں اُن کے دربار میں حاضر ہوئے۔ آداب بجالانے کے بعد ہی بہرام شاہ نے مسعود سعد سلمان کو ایک رباعی کہنے کو کہا تھا۔ تو فوراً مسعود سعد سلمان نے رباعی پیش کی۔

ہموارہ رخ نگاہ مانواست نہ گل   زین روح روخ نگارنیکوست نہ گل
مارارخ دوست بایدای دوست نہ گل   زیرا گل چشم مارخ اوست نہ گل۔[۱۲]

(خزانہ عامرہ، ص،۱۴)

ڈاکٹر محمد ریاض اور ڈاکٹر صدیق شبلی کے مطابق مسعود سعد فارسی کا پہلا شاعر ہے جس نے فارسی شاعری میں مکمل ترین شہر آشوب لکھا تھا۔ اور یہ بھی ان کا ظہار خیال ہے کہ مسعود کا دیوان سنائی نے مرتب کیا، کیونکہ اپنے معاصر شعراء مثلاً ابوالفرج رونی، سنائی، راشدی، معزی

اور عثمان مختاری وغیرہ کے ساتھ دوستانہ روابط قائم تھے،

ای لاہور ویحک بے من چگونہ ای　　　بی آفتاب تاباں روشن چگونہ ای

ای آنکہ باغ طبع من آراستہ ترا　　　بی لالہ وبنفشہ وسوسن چگونہ ای

تو مرغزار بودی ومن شیر مرغزار　　　بامن چگونہ بودی وبی من طگونہ

نالہ عزیز فرزند از تو جدا شدہ است　　　با درداو بہ نوحہ وشیون چگونہ

نفرستی ام پیام ونگوئی بہ احسن عہد　　　کاندر حصار بستہ چو بیژان جگونہء۔ [۱۳]

(فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۱۵۶)

اس کے علاوہ مسعود سعد سلمانؔ نے روز ہائے فرس، ماہ ہائے فرس، روز ہا ہفتہ کے الگ الگ تعریفیں کی ہیں۔ مثلاً روز بہمن اور ارد بہشت کی تعریف یوں کی ہیں۔

بہمن روز ای صنم دلستان　　　بنشین با عاشق در بوستان

شاد نشینیم کزین مملک　　　خلق جہاز ہست ہمہ شادمان

☆☆☆

ارد بہیشت روز است ای ماہ دلستان　　　امروز چون بہشت برنیست بوستان

زآن بادہ کہ خرم از وگشت عیش وعمر　　　زآر بادۂ کہ گرددازوتازہ طبع وجان۔ [۱۴]

(دیوان مسعود، ص، ۶۵۹)

مسعود سعد سلمانؔ نے روز جمعہ کی تعریف یوں کی ہے۔

آدینہ مزاج زھرہ دارد　　　چون آمد لہو وشادی آرد

ای زھرہ جمال بادہ دردہ　　　کامروزم بادہ بہ گوارد

بریاد خدایگان عالم　　　کوملک جہن بعدل دارد

شاعر نے اپنی شاعری میں مقطع کا خوب استعمال کیا ہے۔ مثلاً

شمع اگر نیست تو چو روشن شمع　　　پیش مسعود سعد سلمان باش

مسعود شہریاری کز عدل او　　　پذرفت کار دولت ودین لاستی [۱۵]

(دیوان، ص، ۶۶۹)

بہر حال مسعود سعد سلمان کی شاعری میں تمام موجودات روحی، خارجی، مادی موجود ہے۔انسان کا لباس، اس کے ظاہری جسم کا خارجی عنصر ہے۔اسی طرح شعر میں وزن و قافیہ۔اس کے باطن اور معنویت میں اس کا واقعی وجود ہے، مسعود سعد سلمانؔ کو زاہد اور پرہیز گاری پر بہت یقین ہے۔مثلاً اس شعر سے معلوم ہوتا ہے۔

تو زاہدی و دو زلف تو آفتاب پرست　　بہ سجدہ اید شما ہردو درگہ و بیگاہ
چرا دو چشم تو دیبای لعل پوشیدست　　اگر نپوشند اید وست زاھدان دیباہ

آخر ۴۹۰ھ میں سلطان کے ایک مقرب کی سفارش پر اس سے قلعہ نای سے رہائی مل گئی۔اور مسعود اپنے گھر آ گئے۔ان ہی دنوں سلطان ابراہیم کے بعد اس کا بیٹا مسعود ۴۹۲ھ میں اس کا جانشین بن گیا تھا، اور مسعود کو قسمت نے ساتھ دینا شروع کر دیا تھا۔اس نے اپنے بیٹے شیرزادہ کو لاہور کی حکومت دے دی۔وہ مسعود سعد سلمان کا گہرا دوست تھا۔اس نے مسعود سعد کو جالندھر کا حاکم بنا دیا۔لیکن بدقسمتی سے ابونصر کو یہ گوارہ نہیں ہوا تھا۔تو اس نے مسعود سعد کو آٹھ سال مرنج کے قید خانہ میں بند رکھا۔کچھ مدت کے بعد طاہر بن علی مشکان کی سفارش پر مسعود سعد کو رہا کر دیا گیا۔اور آخر کار ۵۱۵ھ میں مسعود سعد سلمانؔ اس دنیای فانی سے رحلت فرما گئے۔

مسعود سعد سلمانؔ نے ہمیشہ پروردگار کو یاد رکھا، اس کی یاد میں اپنے آپ کو فنا کر ڈالا تھا۔انہوں نے اپنے رباعیوں کے ذریعے عشق حقیقی کا درس دیا ہے۔عشق حقیقی کا پرتو ان کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔ان کی چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیں، جن سے عشق حقیقی کے گہرے جذبات پر روشنی پڑتی ہے۔

از دل بدم آتشی برانگیختہ ام　　وز دیدہ بجای آب خون ریختہ ام
با عشق تو جان و دل در آمیختہ ام　　نتوان چستن کہ محکم آویختہ ام

☆☆☆

تا روز ہمہ شب از ہوس بیدارم　　تا شب ہمہ روز درغم و تیمارم
یارب تو نکوکن کہ تبہ شد کارم　　دانم کہ کنی اگرچہ بد کردارم

☆☆☆

امروز دراین حبس من آن منعمم — کز خواری کس گوش ندارد سخنم
در چندین سنگها دراین که منم — از بی سنگی گوز بدندان شکنم ۔۱۶

(دیوان مسعود،ص،۷۱۱)

مسعود سعد سلمانؔ کو دنیا کی ہر شے میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔انہوں نے اپنی رباعیوں میں عشق کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔انھوں نے ہجر کے مصائب بیاں کئے ہیں۔اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ وصل معشوق نہایت مشکل امر ہے۔

ساقی کہ بدست من دھد جام شراب — از می کنمش تہی واز دیدہ پرآب
می خوردن من درین غمان ہست ثواب — کر دردکم آگاہ بودمرد خراب
چون دولت تو جہان جوانست ای شاہ — پس دولت تو مگر جہانست ای شاہ
بزم تو بحسن بر بوستانست ای شاہ — گوئی زشکوفہ آسمانست ای شاہ
دولت زعلاء دولت عالی رای — برعالم سایہ کرد چون پر ہمای
ای دادہ خدایت شرف از بہر خدای — یکبار مرا جمال رویت بنمای ۔۱۷

(دیوان مسعود،۷۲۱)

مسعود سعد سلمانؔ کے یہاں نعت ومنقبت کی کافی رباعیاں ملتی ہیں۔اس کے علاوہ کچھ رباعیاں مغفرت کی بھی کہی ہیں۔ان تمام رباعیوں میں خلوص کی اور صداقت کی جھلک صاف طور پر نمایاں ہے۔جب طاہر علی نے سعد سلمان کو قید سے آزاد کرایا تو اس وقت شاعر نے ان کی شان میں یہ مدحیہ رباعی پیش کی۔

درخدمت طاہر علی بارم جان — کز خدمت طاہر علی دارم جان
ہر صبحدمی روان نہم برکف دست — درخدمت طاہر علی آرم جان

بہر حال مسعود سعد سلمان کامیاب شخصیتوں میں سے ایک ہے جو صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور بلاشبہ وہ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے عظیم ترین شاعروں میں سے ایک

ہے۔وہ لازمی طور پر شاعری میں ابوالفرج رونی کا شاگرد تھا،جیسا کہ وہ مندرجہ ذیل رباعی میں تسلیم کرتا ہے۔

ای خواجہ ابوالفرج نکنی یادِمن تا شاد گرددایں دل ناشادمن
نازم بدانکہ ہستم شاگردِتو شادم بدانکہ ہستی استادِمن

قدیم زمانہ میں ان لوگوں کے لئے جو دربار میں شاعرانہ اعزاز کی آرزو رکھتے تھے۔یہ ضروری تھا کہ وہ بدیہہ گوئی کی قابل ذکر صلاحیت رکھیں۔جب کبھی موقع آتا،مسعود فی البدیہہ رباعیاں کہنے کی عظیم الشان صلاحیت اور غیر معمولی استعداد رکھتا تھا۔مندرج ذیل رباعی اس کی متعدد مثالوں میں سے ایک اور ہے۔

ہموارہ رخ نگاہ ما تواست نہ گل این روی رخ نگارنیکواست نہ گل
مارارخ دوست بایدای دوست نہ گل زیراگل چشم مارخ اوست نہ گل

☆☆☆

ابوالفرج رونیؔ:

ابوالفرج رونؔی کا شمار ہندوستان کے ابتدائی شعراء میں ہوتا ہے۔جنہوں نے پہلے فارسی ادب کی آبیاری کی ہے۔ابوالفرج بن مسعود رونہ کے رہنے والے تھے۔ڈاکٹر علی سلمان رضوی کے مطابق ''رون'' لاہور کے قریب ایک قصبہ کا نام ہے۔لباب الالباب کے مصنف عوفی کے بھی مطابق رونہ ضلع لاہور کا قصبہ ہے۔ڈاکٹر صفاء نے رونہ کو نیشا پور کا ایک قصبہ قرار دیا۔لیکن صفاء نے بھی ابوالفرج کی ولادت کو لاہور میں ہی لکھا ہے۔بہر حال زیادہ محققین نے ان کی جائے ولادت لاہور ہی لکھا ہے۔فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ میں مصنف نے ابوالفرج کے بارے میں یوں بیان کیا ہے۔

''ابوالفرج سلطان ابراہیم بن مسعود غزنوی (۴۵۰ھ۔۴۹۲ھ)
اور سلطان ابراہیم (۵۹۲ھ۔۶۰۸ھ) اور امراء کی مدح کرتا رہا'' ۱۸
(فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ)

ابوالفرج اپنے معاصر شعراء میں استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔اس عہد کے تمام معاصرین ابوالفرج کو عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔حتیٰ کہ پیغمبر سخن انوری نے بھی ان کے سبک پیروی کی تھی۔انورؔی نے اپنے دیوان میں استاد کے بارے یہ اشعار قلم بند کئے ہیں۔

یاد معلومش کہ من خادم بہ شعر بوالفرج
تا شنیدستم و لوعی داشتم بس تمام

دیحک ای صورت تصور نہ باغی تہ سرای　　بل بہشتی کہ بدنیات فرستاد خدای
اندران مجلس کہ من داعی بشعر بوالفرج　　تا شنید ونوی داشتم بس تمام

ابوالفرج رونؔی نے ان دو اشعار کو اس قطعہ میں بیان کیا ہے

نعن اسپ تو ہلاال است وستامش کو کبست　　آفتاب است او واسیش آسمانہا را مدار
آسمانی پر کواکب برزمین ہرگز کہ دیر　　کہ آفتاب او یکی باشد ہلال او چہار

ان کے علاوہ فیضؔی نے بھی ابوالفرج رونؔی کی سبک کی پیروی کی تھی۔فیضؔی نے ابوالفرج کے بارے میں یہ قطعہ قلم بند کیا ہے۔

فیضی منم آنکہ در معانی کامی بدوصد نہج گرفتم
ذوقی کہ تو ان گرفتن از شعر از شعر بوالفرج گرفتم ۔[۱۹]

(تذکرہ شعرائے پنجاب ،ص۶۴)

ابوالفرج علمی فضائل اور اچھے اخلاق کا حامل تھا۔نہایت متقی و پرہیز گار تھا۔انہوں نے اپنی زندگی کے واقعات اور مختلف تجربات کونہایت پر معنی طریقے سے شاعری میں بیان کیا۔دنیا کی ناپیداری ہمیشہ ان کے ذہن میں سوار رہی ۔یہی درس ابوالفرج رونؔی نے اپنے رباعیات کے ذریعے دیا ہے۔

بادی کہ درآئی بہ تنم ہچو نفس ناری کہ بسوزی دل عالم بہوس
آبی کہ بشوتو ان بودن وبس خاکی کہ بہ تست بازگشت ہمہ کس ۔[۲۰]

(انجمن ،ص ،۲۲)

ابوالفرج نے رباعیات کے ساتھ ساتھ قصیدے بھی لکھے ہیں جومختلف بادشاہوں کی مدح میں بیان کئے ۔ ابوالفرج کے قصیدوں میں تمام صفات پائے جاتے ہیں۔اس کے قصیدے سلطان رفی الدولہ ابراہیم مسعود تخمد اللہ کے شان میں ہے اور کچھ قصیدے معزز حضرات کی مداحی پر مشتمل ہیں۔

روز بازار ملک ہفت اقلیم بشت حق بوالمظفر ابراہیم
شہر یاری کہ طول وعرض فلک ہمش رانیامدست جسیم
پیش سلطانش آسمان عاجز نز دمصروفش آفتاب لیئم ۔[۲۱]

(تذکرہ شعراء پنجاب ،۶۲)

ابوالفرج نے اخلاقی اوراجتماعی مسائل پر قطعے لکھے اور بہترین رباعیاں بھی اس کی یادگار ہیں۔ابوالفرج کا دیوان ایران سے پروفیسر چایکین کے اہتمام کے شائع ہوچکا ہے۔یہ دیوان قصائد کے علاوہ رباعیات ،قطعات اورغزلیات پر مشتمل ہے۔اسکے اشعار کی مجموعی تعداددس (۱۰) ہزار شعر بتائی جاتی ہیں۔لیکن وقت کی فتوحات کی وجہ سے ان کا اکثر کلام مرتب نہیں ہوا ہے۔اس کے دیوان میں نئی فکریں، پیچیدہ مضامین یا مستقل آزمائشا دیکھنے کونہیں

ملتیں ۔ جو کچھ ہے وہ صرف شاعرانہ اور استادانہ انعکاس ہے۔اس کے ساتھ اس کے کلام کا مطالعہ قارئین کو ایک عظیم ہنرمندانہ لذت سے دو چار کرتا ہے۔ابوالفرج کے کلام میں قدماء کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔اس کے کلام سے قدماء کے کلام کی مہک و بو آتی ہیں ۔

نوروزِ جوان کرد بدل پیرو جوانرا — ایام جوانیست زمین راوزمانرا
ہرسال درین فصل برآرد فلک پیر — چون طبع جوانان دوست جہانرا
گرشاخ نوان بودز بی برگی بی برگ — از برگ نوادارقضا شاخ نوارا
مرغ از طلب دانہ فرد ماند کہ دانہ — درخاک ہمی سبز کند روی مکانرا
آن غنچہ گل بین کہ ہمی نازد برباد — از خندہ وز دیدہ فرو بستہ دہانرا۔۲۲

(فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ،۱۵۴)

ابوالفرج غزنوی دور کے ممتاز شاعر مانے جاتے تھے۔اس کی عظمت ورفعت کا اندازہ اس بات سے کیا جاتا ہے کہ مسعود سعد سلمانؔ، ظہیر فیضی جیسے قادرالکلام شعراء نے اسے خراج تحسین پیش کیا ہے۔اس کے کلام میں علمی اصطلاحات ،نئی تراکیب ،اچھوتی تشبیہات اور نازک خیالی عام ملتی ہے۔الفاظ کے انتخاب میں وہ بہت محتاط نظر آتا ہے۔ابوالفرج رونیؔ اکثر مشکل بحریں اور طویل ردیفس استعمال کرتا تھا۔اسکے علاوہ زیادہ تر مبالغے اور غلو سے کام لیتا تھا۔

درخطابش کہ رفیق مذہب اوست — درفناسغ ذید عظام رمیم
رای او عاطفت بکار آورد — ہریکجا دید مسلک دریتیم ۔۲۳

(تذکرہ شعرائے پنجاب،ص۱۶۲)

کہا جاتا ہے کہ مسعود سعد سلمانؔ ابوالفرج کے شاگرد تھے۔انہوں نے اپنے دیوان میں استاد کی ستائش اس طرح بیان کی ۔

خورشید جہان بوالفرج آن فارس عالم — نصرآنکہ بدو فخر کند گوہر آدم
درحشر بفردوس بدونادِ رستم — زیرا کہ چواونیست خداوند مکرم
شادست ہمہ سالہ از وخسرو اعظم — درملک چواونیست یکی رادنکوکار۔۲۴

(دیوانِ مسعود،ص،۵۵۰)

ابوالفرج رونؔی نے غزلیات، قصائد کے ساتھ ساتھ رباعیات میں بھی کمال حاصل کیا ہے۔اس کے دیوان میں رباعیات کا باب رنگین ونمایاں نظر آتا ہے۔رونؔی کے دیوان میں بہت رباعیاں موجود ہے۔دیگر ایرانی شعراء سے ابوالفرج نے رباعی گوئی پر زیادہ لکھا ہے۔ان کے رباعیات کا مجموعہ الگ نہیں شائع ہوا ہے۔مگر ان کی رباعیاں دیگر کتابوں میں کافی تعداد میں موجود ہے۔خاص کر کرنل خواجہ عبدالرشید نے بہت محنت کر کے ان کی کافی رباعیوں کو جمع کیا ہے۔ابوالفرج کی رباعیاں موضوعات کے اعتبار سے بادہ شیراز معلوم ہوتی ہیں۔ابوالفرج نے فنا اور دنیا کی بے ثباتی کے متعلق پراثر رباعیات کہی ہیں۔ابوالفرج کی رباعیات کا رنگ مسعود سعد سلمانؔ کی رباعیات سے جدا ہے۔مسعود سعد اور بوعلی شاہ قلندر کی طرح ابوالفرج کے یہاں حسین تشبیہات اور رنگا رنگ استعارات کے جلوے نظر نہیں آتے ہیں۔تاہم ان کی فنا کی رباعیات میں دوررواثر موجود ہے۔

یک چند مرا بوعدہ میفر سائی　　　یک چند اگر صبر ہمی فرمائی

آنگہ کہ مرا بکشی از تنہائی　　　چہ سود وزبان گرائی وگرنائی ۔۲۵

(آتشکدہ، ۲۲۷)

ابوالفرج رونؔی کی عشقیہ رباعیات بھی نہایت پرسوز و پرتاثیر ہیں۔ان کی رباعیات میں عشق حقیقی کے جذبات موجود ہے۔ان کی ہر رباعی دل کی ایک تصویر نظر آتی ہیں۔

چون یار ببوسہ دادنم یاز گرفت　　　زلفش بگرفتم ازمن آزاد گرفت

چون باری من ہمی خوار گرفت　　　زآن خواست بدست من ہمی سار گرفت ۲۷

(تذکرہ شعرائے پنجاب، ۱۶۳)

ابوالفرج بہت پرہیز گار شخص تھے۔پرور دگار کے رحم وکرم پر ہمیشہ انہوں نے ناز کیا ہے۔پروردگار کے بارے میں یہ خیال کیا کرتے تھے کہ اگر خدا کی ذات پر ایک گناہ گار اعتماد کرے تو اس کی بخشش ہوسکتی ہیں۔دو مذہبی رباعی کو پیش کرنے کی سعادت کرتا ہوں۔

چون زور ملک چرخ درآورد بزہ　　　از چرخ ملک بانگ برآورد بزہ

خم داد زشت تیرو برداشت گرہ　　　بگشاد گشاد او حسام دو زرہ۔۲۷

(تذکرہ شعرائے پنجاب، ۱۶۴)

اس رباعی سے ابوالفرج کی ذہانیت معلوم ہوتی ہے۔ کہ اس کو قرآن مجید کی تفسیر پر کتنا عبور حاصل تھا۔ سورہ آل عمران کی تفسیر میں یہ رباعی لکھی تھی۔

مال دادن جز بحق اسرف دان　　اینکہ ازقرآن بخوان راتسرفوا

از برای دین ہمہ دنیابدہ　　لن تنالوا البرحتی تنفقوا۔ ۲۸

(لباب الالباب ۴۱۹)

دنیا کی بے ثباتی کو ابوالفرج نے رباعیات کے ذریعے خوب بیان کیا ہے۔ وہ انسان کی زندگی کو ہیچ سمجھتا ہے۔ ان کے مطابق انسان کو دنیا کے مال وزر پر غرور نہیں ہونا چاہیے چند رباعیاں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ہر تیر کہ در جعبہ افلاک بود　　اما جگہش این دل صد چاک بود

تا چرخ چنین ظالم و بیباک بود　　آسودہ کسیکہ درتہ خاک بود

(۲) گفتم کہ فروشوم بکوی دیگر　　دل شاکینم بخو پروی دیگر

این بادنمی جہد جز آنجا کہ توئی　　وین آب نمی رود بجوی دیگر۔ ۲۹

(تذکرہ شعراء پنجاب، ص، ۱۶۴)

مذکورہ رباعیات کے علاوہ ابوالفرج رونی نے مدحیہ رباعیاں بھی لکھی تھی۔ خاص کر وزیر مملکت بہروز کی تعریف رباعیوں کے ذریعے بیان کی۔ جیسے:

گر بخت راوجاہت واقبال رایدست　　از خدمت محمد بہروز احمداست

از حرف ھای ابجدعقدس براستی　　مانندہ تربہ حرف نخستین ابجداست

اسی طرح خواجہ عمید منصور احمد بن احمد الحسن المیہندی کی تعریف بھی رباعیوں کے ذریعے کی۔

جشن فرخندہ فروردبنست　　روز بازار گل و نسر بنست

باغ پیراستہ گلزار بہشت　　گلبن آراستہ حوراتعنست۔ ۳۰

(تذکرہ پنجاب، ص ۱۶۴)

بہرحال مندرجہ بالا صفحات میں ابوالفرج کی رباعیات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہیں۔ ان رباعیات میں غالباً وہ ہی خوبی پائی جاتی ہیں جو ابوالفرج کی غزلوں، قصیدوں میں

پائی جاتی ہیں۔یہی سبب ہوا کہ ابوالفرج کی دوسرے اصناف سخن کی طرح رباعیات کا باب بھی کافی مقبول ہوگیا ہے۔ بڑے سے بڑے شعراء نے بعد میں ان کی پیروی کی ہیں۔اصل میں حقیقت یہ ہے کہ ان کی ہر رباعی اہمیت کی حامل ہے۔کچھ اہم عناصر ابوالفرج کے کلام میں ایسے نمایاں ہے جن کی وجہ سے رونؔی کو استادالشعراء اور فصح البلغاء کہا جاتا ہے۔تاریخ کے مطابق ابوالفرج رونؔی نے تقریباً ۱۲۰سال کی عمر گذاری ہے۔اکثر و بیشتر عمرعزیز میں اس نے بادشاہوں کی خدمت کی۔ بہت سے جنگوں کا ذکر ابوالفرج نے اپنے کلام میں کیا ہے۔

(۱) ازعہد برازنفافت ای شمع سرور چون آتش مست نمای نزدیکی دور

چون ازتب وتابش توگشیتم نفور خواہی ہم نادمباش خواہی ہمہ نور

(۲) گفتی کہ فروشدم بکوی دیگر دل شاد کنم بہ خوبروی دیگر

این بادنمی جہد برآنجا کہ شوی وین آب نمی رود بہ جوی دیگر۔۳۱

(ریاض الشعراء،ص،۷۷)

ابوالفرج کے عشقیہ رباعیات میں مستی وسرشاری ،بیداری و ہشیاری ،سپردگی داز خودرفتگی کے عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں۔

درعشق تو خوشدل زمن ہزارست روشادنشین کہ برمراوت کارست

توکشتن من میطلبی وین سیاست من وصل تومی جویم واین دشواراست۔۳۲

(تذکرہ شعرائے پنجاب،ص۱۶۴)

بہرحال کلام ابوالفرج رونؔی سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ اس میں صنعت گری،تزین کاری بہ درجہ اتم موجود ہے۔ان کے نزدیک شاعری اپنی قدرت کلام اورزور بیان کا مظاہرہ کرنے کی چیز ہے۔ابوالفرج کے نظر میں کلام کی ظاہری پیش کش کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور نہ ہی وہ اس طرف توجہ دینے کی کوشش کرتا۔ان کا ماننا ہے کہ اشعار پر الہام وارد ہوتا ہے۔اس الہام کی برتک سے وہ ادبی دنیا میں شہرت حاصل کرتا۔ابوالفرج نے زندگی کا زیادہ حصہ لاہور میں بسر کیا۔ پہلے سے ہی لاہور میں ادبی ماحول موجود تھا جس کا گہرا اثر ان کی زندگی پر پڑھ گیا۔ یہ سارا کچھ رونؔی کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے۔کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رونی کو زندگی میں

آسودگی میسر نہیں ہوئی ہے۔

ابتدائی عہد میں فارسی شعراء کو سارے اصناف سخن میں شاید ہی سبقت حاصل ہوتی ہے لیکن ابوالفرج روؔنی کا یہ حال نہیں ہے انہوں نے رباعیوں کی خاصی تعداد نظم کی ہے اور وہ اس کے قصائد کی طرح عمدہ ہیں۔ دوسرے شعراء کی طرح ابوالفرج نے بھی عمر کے آخری ایام میں عروج حاصل کیا۔ روؔنی ۱۰۹۲ء کے بعد فوت ہوا۔ رباعیات میں ابوالفرج کا طرز غیر معمولی طور پر لچکدار ہے اور اس کی فنکاری سبک اور نغمہ آگیں ہے۔ اس کی رباعیوں میں خاصا جوش، حرارت اور غیر معمولی شیرینیت پائی جاتی ہے، یہ بالکل ممکن ہے کہ ابوالفرج کے اشعار نے عمر خیام کو اپنی رباعیاں لکھنے میں متاثر کیا۔ بے ترتیب طور پر انتخاب کے ہوئے ذیل کے نمونے اس کے خیالات اور شاعرانہ اسلوب کی نمایاں خصوصیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

(۱) تاریک نفس از حیات باقی است مرا — در سرّ ہوس شراب وساقی است مرا
کاری کہ من اختیار کردم این بود — باقی ہمہ کار اتفاقی است مرا

☆☆☆

(۲) از درد فراقت ای بلب شکرناب — ئی روز مرا قرار وفی در شب خواب
چشم و دل من ز ہجرت ای درخوشاب — صحرای پر آتش است و دریا پر آب

☆☆☆

(۳) چون است کہ عشق اولا زتن خیزد — زو بر دل وتن ہزار شیون خیزد
آری بخورد زنگ ہمی آہن را — ہر چند کہ زنگ ہم از آہن خیزد

☆☆☆

(۴) تاباز ترا بدیدہ ام زار ترم — دیدار تر از جانِ خریدار ترم
تو خفتہء چو ظالمان خوش و من ہمہ شب — از دیدہء مظلومان بیدار ترم

☆☆☆

(۵) از ہر کہ دھد پند شنودن باید — با ہر کہ بود رفق نمودن باید
بہ کاشتن و نیک فزودن باید — زیرا کہ پس از کشت درودن باید ۳۳

(ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء، ص ۴۹)

مذکورہ بالا رباعیات سے معلوم ہوتا ہے کہ رباعیات میں جولافانی ذخیرہ ہمیں ملتا ہے یہ صرف ابوالفرج رونؔی کے بعد کے شعراء کے رباعیات کا ذخیرہ ہی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ذخیرہ اس سے قبل ابوالفرج کی حسین رباعیوں میں موجود تھا۔

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر

شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر کا شمار ساتویں صدی اور آٹھویں صدی ہجری کے مشہور صوفیوں اور مجذوبوں میں ہوتا ہے۔ شیخ بوعلی قلندر کو ان اولیائے کرام کے ساتھ وابستگی تھی جن کے حالات اور کمالات پر عقلِ انسانی حیران رہ جاتی ہے۔ ان کا نسبی تعلق حضرت امام اعظم سیدنا ابوحنیفہ سے ملتا تھا۔ آپ کے والد بزرگ اپنے وقت کے بہت بڑے صاحب معرفت عالم تھے۔ انھوں نے مدارج باطنی طے کرتے ہوئے قلندری تخلص اختیار کیا۔ بوعلی شاہ قلندر کے حالاتِ زندگی کے بارے میں بہت کم مستند معلومات ملتے ہیں۔ کچھ محققین کے مطابق آپ کے والد بزرگ کی عراق سے ہندوستان آمد کے چار سال بعد شرف الدین قلندر کی ولادت ہوئی تھی۔ یعنی ۶۰۰ھ میں ان کے والد ہندوستان آئے اور ۶۰۴ھ میں بوعلی شاہ کی پیدائش ہوئی۔ ڈاکٹر ریاض اور ڈاکٹر صدیق شبلی نے اپنی کتاب ''فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں یوں ذکر کیا ہے۔

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر ۱۲۰۸ء بمطابق ۶۰۵ھ میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کرکے دہلی میں درس وتدریس میں مشغول رہے، پھر یکا یک ان کی زندگی میں ایسا انقلاب آیا کہ سب کچھ چھوڑ کر انہوں نے جنگل کی راہ اختیار کرلی۔ عمر بھر مجذوب رہے۔ تذکرہ اولیائے کرام اور بزم صوفیہ میں بھی یہی تاریخ ولادت موجود ہے۔ کتاب ''پانی پت اور بزرگان پانی پت'' میں ان کی تاریخ ولادت ۶۰۴ھ لکھی گئی ہے۔ بوعلی کی والدہ گرامی مولانا سید نعمت اللہ ہمدانی کی بہن تھیں۔ یہ خاندانی تاثیر بوعلی شاہ کی زندگی پر سیدھے پڑھ گیا۔ فارسی ان کی مادری زبان ہونے کی وجہ سے بچپن سے اس زبان کے ساتھ لگاؤ رہا۔ شروع سے ہی مروجہ علوم وفنون حاصل کرکے ان پر دسترس حاصل کی۔ گلزار ابرار کے مصنف کے مطابق آپ نے ابتدائی تعلیم شیخ شرف طعمہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد مولانا سراج الدین مکی سے استفادہ حاصل کرلیا تھا۔ مولانا سید میاں نے اپنی کتاب ''پانی پت اور بزرگان پانی پت'' میں یوں بیان کیا ہے۔

''مولانا سراج الدین مکی استادان عاشق الٰہی بود ودوصدوسی سال عمر شان بود'' ۳۴؎

(پانی پت اور بزگان پانی پت، ص ۳۶)

اپنے زندگی کے چالیس سال پانی پت میں گذارے۔ بعد میں دہلی میں دیرانہ قیام کیا اور تعلیم و تدریس میں بہت مصروف ہو گئے۔ علمی قوت کی بنا پر سیاسی میدان میں بہت مشہور ہوئے۔ وقت کے حکمرانوں نے منصب قضا آپ کے ہاتھوں سپرد کر دیا۔ اس اعلیٰ عہدے پر بیس سال تک کام کیا تھا۔ اسی دوران علماء کی ایک جماعت نے ان کی مخالفت کرنی شروع کر دی۔ جن میں ان کے استاد مولانا سراج الدین اور مولانا امیر علی کے نام سرفہرست ہیں۔ اس گروہ کے علاوہ کچھ لوگ ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ وہ ان کی علمی معیار اور فضیلت کے معترف تھے۔ بوعلی شاہ قلندر نازک مزاج کے شخص تھے۔ اس لیے کچھ علماء کی نکتہ چینی سے متاثر ہو کر قلندر نے استادی اور فتویٰ نویسی کی خدمت کو چھوڑ دیا۔ اور تصوف کی راہ اختیار کر لی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی تصنیف ''اخبارالاخیار'' میں لکھتے ہیں کہ بوعلی شاہ قلندر کو جب جذبہ شوق غالب ہو گیا۔ تو اس نے تمام علوم جیسے شریعت، طریقت، ریاضت وغیرہ چھوڑ دیے۔ علم معرفت ومجاہدہ میں اتنے مشغول ہو گئے کہ انہوں نے اپنی آبادی کو چھوڑ کر صحرا کا رخ اختیار کیا۔ علوم وفنون کے تمام کتابوں کو دریا برد کر لیا تھا۔ امین رازی 'ہفت اقلیم'' میں یوں رقم طراز ہے۔

''شرف زعشق تو آن قلندر سرمست

کہ جملہ مدعیان ازمہابتش مردند'' ۳۵؎

(ہفت اقلیم، ص، ۴۶۱)

پیدائش سے ہی بوعلی شاہ قلندر میں کرامتیں نظر آتی ہیں۔ ان کی ایک کرامت کے بارے میں فاروق ارگلی نے اپنے مقالے ''حضرت شرف الدین بوعلی قلندر'' میں یوں بیان کیا ہے۔

''روایت ہے کہ ولادت کے بعد آپ نے تین دن تک ماں
کا دودھ نہیں پیا اور مسلسل رونے لگے۔ تیسرے دن جب
حضرت فخر الدین کے دروازے پر ایک مست خدا قلندر آیا

۔اس نے فخر الدین سے کہا کہ جو بچہ تمہارے یہاں پیدا ہوا
ہے اس سے لا کر دکھاو' ۔حضرت نے بچے کو لا کر قلندر کو
دکھایا۔قلندر نے بچے کی پیشانی کو بوسہ دیا۔اور قرآن کریم
کی ایک آیت شریف بچے کے کان میں پڑئی۔اسی وقت بچے
کا رونا بند ہوگیا تھا۔اور بچے نے ماں کی گود میں خوشی خوشی
سے دودھ پینا شروع کردیا۔''۳۶؎

(ماہنامہ نظامی آواز،ص ۸)

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر نے اپنے دیوان میں بھی بعد میں اشارہ کیا کہ وہ کون صاحب ہمارے دروازے پر آیا تھا۔

بوعلی لا مائیم و مولا علی　　　بوعلی باشد علی مولائے ما ۳۷؎

(دیوان بوعلی،ص ۲۷)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شروع سے ہی بوعلی شاہ کی تربیت نیک سیرت ماں کے گود میں ہوئی تھی۔ اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بوعلی قلندر مادر زاد ولی تھے۔قلندر صاحب کی تصنیفات میں دو مثنویاں اور ایک کلیات یادگار ہے۔مثنویاں ''کنز الاسرار'' اور'' رسالہ عشقیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔کنز الاسرار مختلف حکایات کا مجموعہ اور'' رسالہ عشقیہ'' تین سو باسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ بوعلی شاہ قلندر کی کلیات میں تقریباً ستر سو اشعار موجود ہیں۔جس میں قصیدہ، رباعی،قطعہ اور غزل کے عمدہ نمونے ہیں۔رسالہ عشقیہ مشہور ترین مثنوی ہے۔

شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر نے مولانا رومی کی پیروی کی ۔عشقیہ شاعری کے بارے میں جو بوعلی شاہ نے لکھا اس سے نہ صرف فارسی شناس واقف ہے بلکہ علوم اسلامی سے تعلق رکھنے والے بھی واقف ہیں۔مولانا رومی نے عشق کو جالینوس اور افلاطون قرار دیا ہے۔حسب ذیل بوعلی شاہ قلندر نے عشق کے معیار کو بیان کیا ہے۔

عشق می داند ہمہ بازی و پیچ　　　غیر عشق آخر چہ باشد ہیچ ہیچ
عشق شور انگیز باشد در جہان　　　او خبر دارد ز خورشید نہان

چیست اسرار نہان عشقت وبس　　کی شناسد عشق را بوالہوس

عشق چون مستی کند ای ہوشار　　صد ہزاران می کشد دریای دار

عشق مخمور است و دایم عشق است　　عشق گرداند فنا ہوش کہ ہست۔ ۳۸

(کلام قلندری، ص۱۴)

شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر نے اپنے کلام میں مولانا رومی کے الفاظ، کلمات اور محاورات کو استعمال کر کے شاعری کو زینت دی۔ اور بعض اصطلاحات کو بھی بغیر کسی تبدیلی کے اپنے کلام میں موزوں کیا ہے۔ مثال کے طور پر رومؔی نے شعر میں لفظ ''سوفسطائی'' کو استعمال کیا، اسی طرح بوعلی قلندر نے بھی اپنے شعر میں یہی لفظ استعمال کیا ہے۔

گفت ''سوفسطائی'' آن دانائی دہر

کہن جہاں وہم وخیال است درنگر۔ ۳۹

(کلام قلندری، ۱۶)

شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر کے نزدیک زندگی کی یہ تب وتاب اور دنیا کا سارا سوز وساز عشق ہی کا مرہون منت ہے۔ ان کی تمنا ہے کہ سوز عشق دم بدم بڑھتا رہے اور پروانے کی طرح تن من سوز نظر ہوتا رہے۔

دل ز ساز عشق با دلبر رسد　　عشق کو تا جامہ ہستی درد

عشق کو بی بال و پر طیران کند　　عشق کو در لامکان جولان کند

عشق کو تا تاج سلطانی دہد　　عشق کو ملک سلیمانی دہد

عشق کو تا چشم دل بیا کند　　عشق کو تا سینہ پر سودا کند۔ ۴۰

(کلام قلندری، ص ۸۹)

شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندر کی رباعیات فارسی ادب میں خاص مقام رکھتی ہیں۔ صوفیانہ رنگ ان کی رباعیوں میں صاف نظر آتا ہے۔ بوعلی شاہ قلندر کی رباعی گوئی معنی آفرینی، قادرالکلامی اور شاعرانہ عظمت کا واضح ثبوت ہے۔ شیخ بوعلی نے فلسفہ عشق کو رباعیوں کے ذریعے کمال تک پہنچا دیا۔ ان کے کلام میں عشق حقیقی کی حرارت شدت سے محسوس ہوتی

ہے۔خود عشق الہیٰ میں فنا فی اللہ کا درجہ پار کرلیا۔مثال کے طور پر یہ رباعی پیش کرتا ہوں۔

آوازہ عشق ما بہ ہر خانہ رسید — دردل ما بخویش و بیگانہ رسید

از دست غم عشق تو ہر جا کہ روم — گویند زرہ دور کہ دیوانہ رسید

شیخ کی نظر میں عشق کا سلسلہ لامنتہا ہی ہے۔ ہر کوئی صوفی اس میدان میں طفل مکتب ہے انہیں اپنے عشق پر ناز کرنے کے باوجود اپنی حیثیت حضرت عیسیٰ کے گدئے سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی۔مثلاً

ہر پیر کہ درعرصہ عالم نر بود — در بازی عشق ما کم از دختر بود

گر قیمت من بہر دو عالم سنجند — گوئی مثلاً بہائی عیسیٰ خر بود۔[۴۱]

(کلام قلندری، ۱۱۱)

شیخ بوعلی شاہ قلندر کے کلام میں خاص قسم کا ترنم و آہنگ پایا جاتا ہے۔کبھی اشعار میں لفظ کی تکرار نے لطف پیدا کیا۔اور کہا یک ہی لفظ کی نشست و برخاست نے شعر کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ بوعلی قلندر عشق کی پیچیدگی کو موثر انداز میں بیان کرتے ہیں۔آپ کو شریعت نبی ﷺ کا احترام اور لحاظ بدرجہ غایت تھا مثلاً دیوان میں ایک جگہ یوں ذکر کیا ہے۔

مزن بے رضائے محمد نفس — رہ رستگاری ہمیں است وبس،[۴۲]

(دیوان بوعلی،ص،۴۲)

حسن لامتناہی کی دید کے لیے دیدہ وری کی ضرورت ہوتی ہے۔ بوعلی قلندر کو باطنی بصیرت میں کمال حاصل تھا۔ان کی فہم وادراک کی نظر محبوب حقیقی کے حسن کا طواف کرتی ہیں۔اپنے اسی کمال کو بوعلی قلندر نے موثر و دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔ایک ہی دیدہ نے ان کے کلام میں زور پیدا کر دیا ہے۔ذیل کے اشعار سے میں ''دیدہ'' کی یہ مختلف معنونیت اور اثر قابل تحسین ہے۔

(۱) دردیدہ زدیدہ دیدہ ام ترا — با دیدہ چو دیدہ ام پسند دیدہ ترا

با دیدہ کجا دیدہ شود دیدہ تو — ای دیدہ مردیدہ وری دیدہ ترا

(۲) نادیدہ چو دیدہ دل پسندیدہ ترا ‌ ‌ ‌ ‌ وز دیدہ ز دیدہ بعد ازان دیدہ ترا
چون دامن در دیدہ دلم دیدہ تست ‌ ‌ ‌ ‌ چون دیدہ عزیز دارد این دیدہ ترا

شیخ بو علی قلندر کی رباعیاں سید محمد حسین بلگرامی نے اپنی کتاب ''خیابان عرفان'' میں درج کیے ہیں۔اس کے علاوہ مرغوب ایجنسی لاہور سے ''رباعیات قلندر'' کے عنوان سے ایک چھوٹی کتاب شائع ہوئی ہیں۔رباعیوں کے ذریعے بوعلی قلندر نے اسرار معرفت کی نقاب کشائی حسین انداز میں بیان کی ہے۔ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ رموز الٰہی کو کون سمجھ سکتا۔مندرجہ ذیل رباعیات ان کے آئینۂ قلب کی پرچھائیاں ہیں۔

اے آنکہ زنور تو دو عالم روشن ‌ ‌ ‌ ‌ پنہاں تو بہ عالمے چو جان اندر تن
ما منتظر جمال وحدت باشیم ‌ ‌ ‌ ‌ پس پردہ کثرت از رخ خویش فگن

☆☆☆

راہے کہ بکوئے تست بنمائے مرا ‌ ‌ ‌ ‌ نورے کہ بروئے تست بنمائے مرا
راہے دگرم نیست بعالم مطلوب ‌ ‌ ‌ ‌ آں راہ کہ سوئے تست بنمائے مرا
درمشرب ما نہ این حلال است وحرام ‌ ‌ ‌ ‌ از جنت و ناز ما نیائیم بدام
از ہر دو جہاں گذشتہ کردیم مقام ‌ ‌ ‌ ‌ آنجا کہ نہ کفر باشد نے اسلام

☆☆☆

نامد خبرے کہ از کجائیم ہمہ ‌ ‌ ‌ ‌ در بہر چہ در حیات مائیم ہمہ
چوں در تہِ خاک میرویم آخر کار ‌ ‌ ‌ ‌ پس ما بہ تہِ خاک چرائیم ہمہ

شیخ بوعلی قلندر نے عشقیہ رباعیاں بھی کہی ہیں جن میں محبت کی تپش اور عشق کا سوز نمایاں ہے۔ان عشقیہ رباعیات میں انہوں نے عطاؔر اور مولانا رومؔی کی پیروی کی ہیں۔مندرجہ ذیل رباعیات اس بیان کی تائید کرتی ہیں۔

عشق تو بحز منم فگندہ شررے ‌ ‌ ‌ ‌ جز ایں شررم نمی رساند خبرے
جان ودل من ازین شرر پاک بسوخت ‌ ‌ ‌ ‌ از دل خبرے نماند واز جاں اثرے

عشقے کہ مجازیست بود باحرماں　　　　عشقے کہ حقیقی ہست ندارد پایاں
من عاشق آں نیم کہ شانے دارد　　　　معشوق من است کل یوم فی شاں
آوارہ عشق من بہ ہر خانہ رسید　　　　دردِ دل من بہ خویش و بیگانہ رسید
اندر غم عشق تو بہر جا کہ روم　　　　از دور بیندکہ دیوانہ رسید

عطار کی طرح بوعلی قلندر کی رباعیوں میں عشق و محبت کی گرمی پائی جاتی ہے۔انھوں نے اپنی رباعیوں میں عشق کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے بوعلی شاہ قلندر نے ہجر کے مصائیب بیان کئے ہیں۔اور یہ بتایا ہے کہ وصل معشوق نہایت مشکل امر ہے۔بعض رباعیات میں محبوب کے عشوہ غمزہ کی عکاسی کی ہے کہیں جگہ پر پروانہ سے خطاب کیا ہے۔ ہرحال بوعلی شاہ قلندر کی عشقیہ رباعیاں دردسوز میں سراپا ڈوبی ہوئی ہیں۔

گر در رہ عشق می نمائی تگ و تاز　　　　باشی بہ خیال خویش درراز ہ نیاز
معشوق پرست خود پرستی نکند　　　　کو عشق حقیقی و کجا عشق مجاز

بوعلی شاہ قلندر نے مذہبی رباعیوں کی طرف توجہ فرمائی ، چنانچہ ان کے یہاں نعت ومنقبت کی کافی رباعیاں ملتی ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے کچھ رباعیاں دعا مغفرت پر بھی کہی ہیں۔ان تمام رباعیوں میں خلوص اور صداقت کی جھلک صاف طور پر نمایاں ہے۔

نبوشتہ چو بوعلی بہ طغرائے من است　　　　از حیدریان بلندتر جائے من است
مولا منم آں را بہ ولا و بہ وفا　　　　آں حیدرِ کرار کہ مولائے من است
اولادعلی خلاصئہ ابرارند　　　　چوں والد خویش محرم اسرارند
تحلیل موافا سد کفر کند　　　　در منفعت مزاج دیں جدواست

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر حالت جلال میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔وقت کے حکمرانوں میں علاؤالدین خلجی کے ساتھ اچھی بنتی ہیں اور علاؤالدین بھی ان کا بے حد عزت واحترام کرتا۔اس بادشاہ کے علاوہ بوعلی قلندر نے سلطان محمد کا ذکر بھی اپنی کلام میں کیا ہے۔

بسیار درین جہان چمیدیم　　　　بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپانِ بلند بر نشستیم　　　　ترکان گران بھا خریدیم

گشتیم اورتمام وارضعف امروز چون ماہ نوخمیدیم۔۴۳

(فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ،۱۷۳)

بوعلی قلندرغیاث الدین تغلق کوبھی عزیز رکھتے تھے حتیٰ نہ ان کے درباری شاعر تھے اور نہ ہی قصیدہ نگاری ان کی طبیعت کے موافق تھی۔تاہم بھی ان کے شان میں اچھے قصیدے کہہ دیے ہیں۔ان کے شہزادگان اور امراء بھی قلندر صاحب سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔وہ ان کے صحبت میں بیٹھنے اور ارشادات سننے کے لیے خصوصی طور پر جاتے تھے۔

علامہ اقبال نے اسرار و موز میں بوعلی قلندر کے ایک قصیدے کو قلم بند کیا ہے جو اس نے غیاث الدین تغلق کی مدح میں لکھا ہے۔درجہ ذیل چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

دہان ولب وقد وشخصیت نگارہست سیمین بر

یکی راحت یکی بستہ یکی سرو و یکی عسرعر

شہ اعظم غیاث الدین کہ از وآتش مشرف شد

یکی تخت و یکی بخت و یکی خاتم یکی افسر

بہ عزم و جزم وکر وفر وہیبت بی سر اندیشان

یکی بہمن یکی کسریٰ یکی دارا یکی نوذر

چو او شاہی بعالم درنیامد ازعدم بی شک

یکی عادل یکی باذل یکی ضابط یکی داور

زہی شاہی کہ درحلم وحیاوعدل و بزل وحی

یکی بکر و یکی عمر و یکی عثمان یکی حیدر

توئی شاہا درین عالم بہ رزم دوست ودل

یکی حاتم یکی رستم یکی خاقان یکی سرور۔۴۴

(اسرار ورموز،ص۲۴)

غلام سرور لاہوری نے بھی اپنی کتاب ''خزینۃ الاصفیاء'' میں اس گہری عقیدت کو بیان کیا ہے۔

''علاء الدین خلجی و جلال الدین پادشاہان دہلی ہم حلقہ ارادت آنحضرت بگردن خود داشتند'' ۴۵

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۳۲۷)

اگر چہ بوعلی قلندر ہندوستان میں پیدا ہوئے لیکن اس کے دل میں خراسان اور عراق کی بے حد تڑپ تھی ان کی شاعری میں کچھ ایسے بھی اشعار بھی ملتے ہے جن سے اخذ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہونے پر بہت ناراض تھے۔ ہندوستان سے باہر ان کے شاعرانہ کلام کو کافی داد وتحسین حاصل ہوئی۔

مثلاً:

شرف بہند در عارفی کشادو فشرد ولی بردم وخراسان ولادیتش دانند
مرا گلہ ز ہندوستان است ہندوی شرف بہند پرست ولیکن عاقیست ۴۶

(کلام قلندری، ص ۱۲۴)

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر نے کافی حد تک عاشق وعشق کے تعلوقات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے نزدیک عاشق اور عشق ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہے۔ آپسی رشتہ کے بغیر کامیابی کے منزل طے نہیں کر سکتے۔ ایک عاشق عشق کی بدولت ہی فنا فی اللہ کے مقام پر پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک جانے میں بہت سارے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ درجہ ذیل کے اشعار میں راہ عرفان کو قلم بند کیا ہے۔

عاشقانِ در پردہ صد پردہ اند ذات حق را عارفان خو کردہ اند
عاشقان مست انداز جام الست ہیچ ناید در نظر بالا وپست
غیر حق ہرگز نہ بیند در وجود ہر چہ ہست از خویش داند نیست بود
عاشقان چون نام حق را بشنوند دین ودنیا ہر دورا برہم زنند۔ ۴۷

(کلام قلندری، ص، ۷)

مولانا رومیؔ کی طرح قلندر نے بھی یاد خدا کو خاص اہمیت دی ہے۔ ان کے خیال میں یاد خدا کی بدولت سے ہی دونوں جہاں کی نعمتیں میسر ہوتی ہیں۔ ان کے مطابق عشق عاشق اور یاد عشق

سب چیزوں کو عقل سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ باوجود فہم ، ادراک کے تابنا کی سے محروم ہے۔ انہوں نے عشق و عقل کا موازنہ کر کے یہ طے کیا ہے کہ عشق ہر صورت میں ارفع واعلیٰ ہے اور عقل فقط جزو کی وقعت وحیثیت رکھتی ہے عشق ہی سب کچھ ہے۔

عقل جزاز عشق کل دایم بپاست　　　عشق کل با عقل کل ہم آشناست
عقل چون در حضرت بیچون رسید　　　عقل جز منکر شود کہ چون رسید

☆☆☆

عشق جان باز آمدہ اندر جہان　　　عقل باشد در پناہ این وآن
عشق باشد نکتہ دان باریک بین　　　عقل را تو جاہل وحیران ببن

یہی باتیں مولانا رومیؒ نے بھی دیوان شمس تبریزی میں اختصار کے ساتھ بیان کی ہے۔

در بیان پردہ خون عشق را گلزار ہا　　　عاشقان را با جمال عشق نہ بیچون کارہا
عقل گوید شش جہت حداست وبیرون راہ نیست　　　عشق گوید راہ است ورفتہ ام من بارہا
عقل بازاری بدید وتاجری آغاز کرد　　　عشق دیدہ زان سوئی بازارہا۔۴۸؎

(دیوان شمس، ص، ۱۲۱)

مولانا رومیؒ کی طرح بوعلی قلندر کا بھی یہی خیال ہے انسان کو چاہے کہ اپنا ہاتھ اس آدمی کے ہاتھ میں دے جو اس کی صحیح رہنمائی کر سکے۔ بظاہر آدمی، دیو اور جن یکساں ہے اور ہر کوئی انہیں پہنچان نہیں سکتا۔ صرف حق شناس اور مرد خدا کو ہی اتنی قابلیت ہوتی ہے کہ وہ ان سے باخبر رہے۔ منافق بندر کی طرح کرتب دکھاتا ہے اور مرد مومن عشقِ خدا کو مقصود جانتا ہے۔ قلندر صاحب نے اس مضمون کو درجہ ذیل کے اشعار میں یوں بیان کیا ہے۔

کی کند سالوس ہان مرد خدا　　　با خدا باشد ہمیشہ نی جدا
کار پاکان با دغل سازان مسنج　　　گر بسنجی رنج بینی گنج گنج
سر ایشان را کجا داند کسی　　　واقف از اسرار نبود ہر خسی، ۴۹؎ (کلام قلندری، ص، ۴)

انندرام مخلصؔ

اصلی نام انندرام تھا اور مخلصؔ کو تخلص کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ ان کی ولادت سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں ہوئی جو سودھرہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ۱۱۱۱ھ بہ مطابق ۱۶۹۴ء سے ۱۷۰۰ء کے درمیان ان کی پیدائش ہوئی۔ مخلصؔ کی پیدائش چھتریان کے ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو علمی لحاظ سے بہت اعلیٰ پایہ تھے۔

خزانہ عامرہ کے مصنف نے مخلصؔ کے آباواجداد کے بارے میں یوں قلم بند کیا ہے۔

''انندرام مخلصؔ از قومِ چھتریان است کی ریاست اہل ہند از قدیم الایام باین گروہ تعلق دارد، وطن اباء او سودہرہ از نوابع لاہور است، خود در شاہجہان آباد بسر میبرد ضابطہ ہند است کہ دربار سلاطین از امراء غائب وحاضر وکلامی باشند۔'' ۵۰

(خزانہ عامرہ، ص، ۴۲۵)

مخلصؔ کے جد شاہی درباروں سے وابستہ رہے۔ خاص کر مغل دور میں اس خاندان کو بہت عروج نصیب ہوا تھا۔ گج پت رائے جو مخلصؔ کے دادا تھے۔ انہوں نے اسد خان وزیر اور میر بخشی ذوالفقار خان بہادر کے دربار میں وکیل کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ انندرام کے والد راجہ ہری رام محمد شاہ کے وزیر اعظم اعتمادالدولہ محمد امین خان بہادر نصرت جنگ کے وکیل تھے۔ ان کے چاچا ''دیا رام'' بھی محمد شاہ کے معتمدین میں شمار ہوتے تھے۔ علمی لحاظ سے انندرام کو بہت قسمت تھی کیونکہ علمی ماحول میں پرورش ہونے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی وراثتی پیشہ وکالت اختیار کیا۔ ۱۱۳۲ھ یعنی ۱۷۴۶ء میں اعتمادالدولہ قمرالدین کے وکیل مقرر ہوا۔ کافی وقت تک یہی پیشہ اختیار کیا۔ ۱۱۵۳ھ میں ''رائے دیان'' کا خطاب ملا۔ ایک ہزار پانصدی ذات اور دوصد سوار کا منصب ملا۔ سیف الدولہ ذکریا خان صوبیدار لاہور کا وکیل بھی رہا تھا۔ تاریخ کے مطابق انندرام کا انتقال ۱۱۶۴ھ میں ہوگیا۔ مزاج کے لحاظ سے مخلصؔ بہت نازک تھے۔ عادات واطوار کے لحاظ سے وہ اسم بامسمیٰ تھا۔ دوستوں کے ساتھ بہت ہمدردی تھی اور ہر مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اپنے استاد سراج الدین علی خان آرزو کو بھی دربار سے خطاب اور جاگیر دلوائی تھی۔ نہایت دقیق القلب شخص تھے۔ شگفتہ طبعی اور بذلہ سنجی اس کے مزاج کا حصہ

تھا۔

مخلصؔ کوشروع سے ہی شعروادب کے ساتھ لگاؤتھا۔جب ہی انندرام مخلص ؔنے ادبی دائرے میں قدم رکھا،ساتھ ہی ان کوجلا جیسی ہوئی تھی۔انندرام ایک اچھے خوش نویس تھے۔خوش نویسی کے ساتھ ساتھ ان کوخطاطی کےنمونے جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔مخلصؔ کوگھر میں ایک اپنا کتب خانہ تھا۔جس میں کافی تعداد میں خودنوشت مسودئے جمع کرکے رکھے تھے۔ان کی زندگی پر نمایاں ادبی اثر نظر آتا ہے۔عملی زندگی میں انہوں نے ایک سعادت مندفرزنداورایک شفیق باپ کی حیثیت سے کام کیا۔

تصانیف انندرام مخلصؔ:۔اگرچہ مخلصؔ نثری نگارشات سے نامور ہوئےلیکن ان کے شعری مجموعےبھی کم پایہ کےنہیں ہیں۔انندرام کی نثری اورشعری تصانیف کا اجمالی تعارف حسب ذیل ہے:۔

(۱)مراۃ الاصطلاح:۔مخلصؔ نے اس کوایک لغت یافرہنگ کےطور پرمرتب کیا ہے۔لیکن مروجہ لغات سے منفرداورمختلف ہے۔اس لغت کی اہمیت کوبیان کرتے ہوئےمخلصؔ نے یوں قلم بندکیا ہے۔

”برخلاف فرہنگ نویسان کہ بہ تحریرلغات قدیم مصروف بودہ بہ تحقیق مصطلحات فارسی گویان تازہ توجہی نمودہ آمد،واز خدمت زبان دانان معتبر بیانہ تحقیق رسید“۵۱؎

(دیباچہ،چمنستان)

اس عہد میں بہت سے فارسی لغات ونصابی کتابیں موجود تھے۔لیکن زبان کی شستگی سے محروم تھے۔اس ضرورت کوپرکرنے کے لیےمخلصؔ نے یہ لغت تیار کی تھی۔

(۲)چمنستان:۔اس کتاب میں مصنف کے ذاتی احوال اورمشاہدے موجود ہیں۔مخلصؔ نے جوبہت سےرنگین احوال اورذکاوت بیان کئے ہیں اس رنگینی کے باعث کتاب کوچمنستان رکھا گیا۔

(۳)گلدستہ اسرار:۔اس کتاب کانسخہ گمشدہ ہےاس کا تعارف سیداظہرعلی نے کرایا ہے۔یہ نادرشاہ کےان خطوط کا مجموعہ ہے جواس نےصوبیدارکابل کولکھے۔وہ ان میں سے ہندوستان کےامور سے متعلق مکاتیب وزیراعظم کے ملاحظہ کے لیےبھیج دیتا ہے۔وکیل ہونے کے ناطےمخلصؔ نے ایک نسخہ اپنے پاس رکھا۔۵۲؎

(پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ،ص۱۷۰)

(۴) رقعات انندرام:۔ یہ کتاب ۱۸۵۲ء بہ مطابق ۱۲۶۹ھ میں شائع ہو چکی ہے۔ مخلص نے اپنے تحریر کردہ رقعات میں ۱۷۳۷ء تک اہم واقعات کا اضافہ کیا ہے۔ بعد میں اس کتاب میں اوراضافہ کیا گیا۔ اس کتاب میں کل رقعات کی تعداد ۳۳۳ ہے جن میں زیادہ اپنے استاد سراج الدین علی خان آرزو کے نام لکھے ہیں۔

(۵) بدائع وقائع:۔ اس کتاب میں ۱۱۴۱ھ سے ۱۱۶۱ھ تک کے تاریخی واقعات موجود ہے۔ جن میں انندرام مخلص نے اکثر خود دیکھے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب میں پانچ شاعروں کا حال بھی بیان کیا گیا ہے

(۶) کارنامہ عشق اور ہنگامہ عشق فرضی کہانیوں پر مشتمل ہیں۔ جو کچھ مخلص کو سنے میں آیا ہے یا جو کچھ تصور کیا گیا اور ہر کچھ اساطیری عناصر داخل کر کے مخلص نے تصنیف کئیں ہیں۔

(۷) دیوان مخلص:۔ کچھ تذکرہ نگاروں کے مطابق مخلص کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ لیکن خوشگو نے سفینہ خوشگو میں مخلص کے اشعار دیوان کی تعداد دس (۱۰) ہزار بتائی ہیں۔ لیکن آج مخلص کا ایک چھوٹا سا دیوان جو کچھ غزلیات اور رباعیات کے مجموعہ پر مشتمل ہے۔ یہ دیوان آنڈیا آفس لائبریری میں شمارہ ۱۷۰۷ پر مشتمل ایک قلمی نسخہ کی صورت میں موجود ہے۔ اس دیوان میں برگ ۱۴۵ سے ۲۶۰ تک قصائد و مثنوی تحریر ہے۔

برگ ۱۴۵ سے ۲۵۵ تک غزلیات اور برگ ۲۵۵ سے ۲۶۰ تک رباعیات شامل ہیں۔ اس نسخے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کو مصنف نے اپنی حیات میں لکھا۔ اس دیوان کی تاریخ کتابت ۱۰ ربیع الثانی ۱۱۵۴ھ (۱۷۴۱ء) بتائی جاتی ہے۔ [۵۳]

(ادبیات فارسی میں ہندوں کا حصہ، ص، ۱۲۸)

(۸) مجموعہ رباعیات:۔ مخلص کے اپنے خط میں رباعیات کا ایک مجموعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مجموعہ شیرانی میں شمارہ pivi110 پر موجود ہے۔ اس میں ۲۵ برگ ہیں جو قابل استفادہ ہے۔ بیشتر نا قابل استفادہ ہے۔ غالباً یہ وہ نسخہ ہے جس کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے۔ کہ انہوں نے یہ نسخہ پروفیسر شیرانی مرحوم کے کتب خانے میں دیکھا تھا۔ اور جس کے صفے کا عکس بھی موصوف نے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ [۵۴]

(ادبیات فارسی میں ہندوں کا حصہ، ص ۱۳۰)

جہاں تک مخلصؔ کی شاعری کا سوال ہے مخلصؔ نثری شاہکار لغت الفرس سے نامور ہوئے تھے۔لیکن شاعری کے میدان میں بھی ان کا اہم رول تھا۔شاعر کی قابلیت ’’مراۃ الاصطلاح‘‘ سے معلوم ہوتی ہے۔مخلصؔ کو ایک متوسطہ درجہ کا شاعر مانا جاتا ہے۔اپنے عہد کے دیگر شعراء کی طرح مخلصؔ کے موضوعات میں کم تنوع نظر آتا ہے۔شاعر نے اپنے کلام کو محدود موضوعات میں بیان کیا ہے۔البتہ انندرام مخلصؔ کو اپنا ایک خاص اندازِ بیان تھا جس سے وہ قارئین کی توجہ کو اپنی طرف راغب کر لیتا۔مخلصؔ کا سارا کلام نایاب ہونے کی وجہ سے ہم ان کا شاعرانہ اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں۔تاہم کچھ تذکروں اور مقالات الشعراء کو مدنظر رکھتے ہوئے آئیندہ صفحات میں مخلصؔ کی شعری خصوصیت کا جائزہ پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی جا سکے۔مخلصؔ کی شاعری کا مخصوص انداز نظر آتا ہے۔زیادہ ان کی شاعری میں خلوص و اخلاص کے موضوعات ملتے ہیں۔یہ اخلاص مخلصؔ کے عشقی میدان میں اور ان کی عملی زندگی میں بھی موجود ہے۔اس کا دل جذبات عشق سے لبریز ہے۔وہ عشق میں دیوانہ نظر آتے ہیں۔ان کی دیوانگی بھی یک گونہ تمکین و وقار کی حامل ہے۔مخلصؔ کا عشق شوریدہ پرتو ہے۔مگر اس قدر نہیں کہ وہ شائستگی اور وضع داری کی حدوں سے بھی نکل جائے۔اس کے عشق کا جذبہ بلبل کی طرح دھیمے دھیمے سلگتے رہتا ہے۔مخلصؔ کے مطابق دل کا مقصد صرف عشق حاصل کرنا ہے اس کے بغیر دل کا کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔مثلاً یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:۔

دل چہ لذت برو بغیر از عشق　　　　نمک زندگی است شور مزاج

بلبل شوریدہ چون من ندارد این چمن　　صد بہار آخر شد من ہم چنان دیوانہ ام۔۵۵

(پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ص ۲۴۵)

رباعیات کا ذخیرہ جو ہم تک پہنچا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلصؔ کو فن پر کس قدر عبور حاصل تھا۔ان کے رباعیات میں عیاں ہے کہ شاعر کا ادبی مطالعہ بہت وسیع تھا۔وہ کافی دقیق اور قدآور نظر آتے ہیں۔غلام علی آزاد بلگرامی نے خزانہ عامرہ میں ان کی شاعرانہ عظمت پر یوں قلم بند کیا ہے۔

’’سخن انندرام قشقۂ قبول بر جبین دارد‘‘۔۵۶

(خزانہ عامرہ، ص ۴۲۵)

والہ داغستانی نے اپنی کتاب میں شاعر کے کلام کے بارے میں یہ بیان کیا ہے۔

’’از جماعت ہنوز درین زمان کسی بجوش محاورگی اونیست‘‘۵۷

(ریاض الشعراء، ص،۴۲۳)

خوشگو نے انندرام کے شاعری کے بارے میں یوں رقم طراز کیا ہے۔

''شاعر معنیٰ تلاش وخوش زبانی مشل اودرین صرف زمان کامیاب است''،۵۸؎

(سفینۂ خوشگو، ص،۳۲۱)

شاعر نے ردیفوں اور متعدد بحروں میں طبع آزمائی کرکے اپنی قدرت کلام کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔اس کے ساتھ یہ بھی امر واقعی ہے کہ نسبتاً چھوٹی بحروں سے موغوب ہیں۔انندرام نے تصوف کے دیگر موضوعات کو رباعیوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ان کے خیالات میں بازگشت موجود ہے لیکن نسبتاً لہجہ زیادہ سنجیدہ اور بیان کا انداز زیادہ لچکدار ہے۔شاعر عشق کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ مصورِ ازل کی ایک لامثال نعمت ہے جو معدودئے چند خوش قسمت انسانوں کو عطا ہوتی ہے۔

عشق است کہ دار و گیر دردی خواہد		آہِ سردی ورنگِ زردی خواہد

دل گرمی طامات نہ سنجد جوی		درعرصہ امتیاز مردی خواہد

مخلصؔ اپنی بات چھوٹے اشعاروں میں پہنچادینے میں بہت قادر ہے عشق کے علاوہ مخلصؔ نے مختلف اخلاقی نظریات یا عملی زندگی میں کام کرنے والوں کو رباعیات میں پیش کیا ہے۔اس کا اندازہ اس رباعی میں لگایا جاسکتا ہے۔

میازار ای محبت باز چون من ناتوانی را		غریبی دردمندی بیکسی آزردہ جانی را

زحال بلبل مسکین نداریم اطلاع اما		بپای گلبنی دیدیم مشت استخوانی را۔۵۹؎

(خزانہ عامرہ، ص،۴۲۵)

مخلصؔ کی شاعری میں فکری گہرائی یا نظریاتی تسلسل بھی نظر آتا ہے۔انہوں نے دیوانگی کو عشق کا پہلا سبق کہا ہے۔عشق میں دیوانگی اور وارستگی جتنی ہوں تو زیادہ مزا آتا ہے۔ان کے نزدیک عشق کی کسک اور سوزش کا بھی الگ مزا ہوتا ہوتا ہے۔مثلاً

بسکہ امشب ریخت لخت دل زچشم زمرا		برگ گل بودہ است گویا فرش پرنشتر مرا

مبادا خواب شیرینم بشور آید پس ازمرون		برون آرید از پہلوِ دل درخون طپا نمیرا۔۶۰؎

(پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ۲۴۰)

مخلصؔ کے ہاں اس قسم کا کوئی دعوانہیں ہے کہ عشق ارضی ہو یا سماوی۔نہ زیادہ اپنی شاعری میں حقیقی معرفت سے مملوکرنے کا اشارہ کیا ہے۔مخلصؔ کا عشق زیادہ تر مجازی نظر آتا ہے۔شاعر کا محبوب دنیا کا مکین ہے۔محبوب کا حسن بھی انسانی ہے۔مخلصؔ نے محبوب کا حسن اس طرح رباعی میں بیان کیا ہے۔

چشم آن نوخط جوان مخموری گردیدہ است یا غزالی درمیان سبزہ خوابیدہ است

دور شد از آتش رخسارتا بانش بلند سوسنی تحقیر بہ آن گل بسر پچیدہ است

خوشگو نے مخلصؔ کی شاعرانہ خوبی بیان کرتے ہوئے اس رباعی کو قلم بند کیا ہے۔

گرفتم از نکاب می گناہ است بہار از جانب ما عذرخواہ است

عکس ابروی تو درآئینہ است مسجد در حلب بناشدہ است۔۶۱

(خوشگو،ص،۳۳۷)

محبوب کے عشق میں عاشق پر گذارنے والے مختلف واردات و کیفیات کو بھی مخلصؔ نے نہایت دلکش اور سادہ انداز میں نظم کیا ہے۔بے تکلفی و بے ساختگی کے ساتھ ساتھ نزاکت خیال قابل غور ہے۔اس رباعی سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلصؔ کو رباعی گوئی پر کتنا عبور حاصل تھا۔

بہر دل ما تیرہ روزان زان صفت مژگان گذاشت

انچہ از فوج دکن بر ملک ہندوستان گذاشت

میزند لا یقطع از خاک مجنون سبزہ جوش

درد مندی ظاہر ازین سرزمین گریان گذشت۔۶۲

(خزانہ عامرہ،ص،۴۲۶)

شاعر کی نظر میں عشق وفاداری خلوص کا دوسرا نام ہے مخلصؔ کا عشق اسے ہرجائی پن نہیں ہے بلکہ کسی ایک سے وابستہ ہو کر اسی کا رہنا سکھاتا ہے۔مخلصؔ کا عشق خالصتاً مجازی ہے

پیر چوں گردیم در گلشن وطن خواہیم کرد خدمت رعنا جوانان چمن خواہیم کرد

تاجر مصریم ای کنعانیاں نذرِ شما تحفۂ مانند بوی پیرہن خواہیم کرد

طرف باغ از خانہ فصل گل خمارم می کشد می کشی در سائیہ تاک انتظارمی کشد

بلبل فرسودہ بالم گاہ گاہی در بہار عشق گل طرف چمن بی اختیار می کشد۔۶۳

(سفینۂ خوشگو،ص،۳۳۵)

شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں اکثر ہنر مند اور فنکار لوگوں کو ناکامیابی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کئی صورتوں میں تو بہت مدتوں کے بعد ہی دنیا ان کے فن کو جان کر مقبولیت دیتی ہے۔ گویا بغیر محنت کے شہریت حاصل ممکن نہیں ہے۔ مخلصؔ نے اسی بات کو شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

نصیب ماحب جوہر ہمیں رانج است از دنیا

نباشد از طلا قسمت بغیر از کوفت آہن را۔۶۴

(پنجاب کے برگزیدہ غزل گو،۲۴۵)

شاعر کے مطابق جس طرح دنیا صاحبان ہنر وفن کو نہیں پہچانتی ہیں اسی طرح صاحبان ہنر مند و علم پرور لوگ بھی دنیا اور دولت دونیا کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں یہ ہمارے لیے بھی نصیحت ہے کہ دنیا کو خاطر میں لانا بھی نہیں چاہے۔ اس خیال کو شاعر نے ایک تمثیل کے ذریعے بیان کیا ہے۔

دستہ دندان ماہی رابود ترجیع عیب

کم بدنیا التفات اہلِ جوہر بودہ است

مخلصؔ نے دنیا کی بے ثباتی اپنے کلام میں خوب بیان کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ دنیا امتحان گاہ سے کم تر نہیں ہے اور جب کوئی میدان عمل میں نکلتا ہے تو اس سے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کسی انسان کو گھبرانا نہیں چاہئے کیونکہ اکثر شہسوار میدانوں میں گرتے ہیں۔ گھر بیٹھنے والوں کو ایسا خطرہ لاحق نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً

آفتی نیست ناتوان را نزد قحط کسی بخانہ مو

بردسودای سر زلف تو از خویش مرا سفری دور و دراز آمدہ

شاعر نے اپنے آپ کو عظیم شعراء سے قرار دیا ہے انہوں نے اپنے کلام میں بہت سے شعراء کی تعریفیں کی ہیں۔ مثلاً

آن سہری سخنوری مخلص فخر عرفی و انوری مخلص

شاعر کے نزدیک غرور کا سر ہمیشہ نیچے رہتا ہے۔ دنیا میں کسی کو بھی دوام نہیں ملتا ہے۔ اس اخلاقی نکتے کو بیان کرنے کے لیے مخلصؔ نے اس شعر کا سہارا لیا ہے۔

گردن دعوایٔ مکن ای شمع در محفل بلند

رونق حسن تو آخر تا سحر خواہد شکست

بہر حال کلامِ مخلصؔ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری بہت دقیق اور شرین ہے۔ اور اسی مخلصانہ باب کی آبیاری کرتے ہوئے شاعر نے تخلص بھی مخلصؔ رکھا ہے۔ شاعر جوانی میں اپنا کلام عبدالقادر بیدل کو دیکھاتے تھے۔ دیوان کے چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہوں تا کہ ان کا معیار معلوم ہو جائے۔

زحال بلبل مسکین ندارم اطلاع ما — بپای گلبنی دیدم مشت استخوانی شکستہ

گردن دعویٰ مکن شمع در محفل بلند — رونق حسن تو آخر تا سحر خواہد

بقربان بتان آخر دل افگار خود کردم — زعالم تا کسی واقف شود من کار خود کردم۔۵۶

(تذکرہ شعراء پنجاب، ۳۳۰)

انند رام مخلصؔ کے کلام میں مشکل مضامین بھی ملتے ہیں جو مناسب الفاظ سے ادا کئے گئے ہیں۔ ان کے کلام میں ضرب الامثال اور اشارات و کنایات اور جدید ترکیبوں کی کمی نہیں۔ تجنیس، ایہام وغیرہ جیسے شعری صنائع بھی ان کے کلام میں کافی پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں۔ اسے ایک پیرائے میں ادا کرتے ہیں۔ ان کے مجموعہ کلام میں شفتگی، انداز بیان کے ساتھ فکری اعتبار سے سبک ہندی کی گہرائی بھی ملتی ہے۔ شاعر کی زبان ایرانی فارسی کے بجائے سبک ہندی کے ہندوستانی شاعروں کی زبان سے قریب ہے۔

بکاغذ باد ماند در صحبت کاروبار من — کہ باشد در کف طفلان عنانی اختیار من

ازان ہر لحاظ در ہر میکشم سرو گلستانرا — کہ این رعنا جوان بسیار میماند بیار من

☆☆☆

چندر بھان برہمن

شاعر کا اصلی نام چندر بھان تھا اور برہمن تخلص کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ لاہور کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ کچھ تذکرہ نگاروں نے ان کی جائے پیدائش اگرہ لکھا ہے۔ لیکن برہمن لاہوری نے خود اپنے جائے پیدائش کی تصدیق کی۔ اس بات کو کرنل خواجہ عبدالرشید نے اپنے تذکرہ میں یوں بیان کیا ہے۔

''من برہمن زادہ پنجابم، آباؤاجداد من بہ اشتعال مختلفہ روزگارمی کردند، مگر دھرم داس پدر من نویسندگی میکرد و در ذیل منصبداران پادشاہی امتیاز داشت''۶۶؎

(تذکرہ شعراء پنجاب، ص، ۳۴۷)

بعض محققین نے اس کا نام دونگرمل لکھا ہے۔ برہمن کے اباؤاجداد کا تعلق خطہ کشمیر سے تھا اور ان کے والد محترم کا نام دھرم داس تھا۔ خود برہمن نے اس بات کا اقرار کیا ہے۔

''نامِ پدرم پندت دھرم داس، اہل خطہ کشمیر بود''

ڈاکٹر طارق کفایت نے اپنے مقالے میں چندر بھان برہمن کے نام اور تخلص کے بارے میں یوں ذکر کیا ہے۔

''برہمن لاہوری کا نام چندر بھان اور برہمن جو ہر دو تلفظ بَرہمن اور بَرَہمَن مستعمل ہے۔ اس کا مولد لاہور ہے۔ اگر چہ کچھ تذکرہ نگاروں نے اگرہ بھی لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے کیونکہ برہمن کے خودنوشت سوانحی خاکے میں لاہور لکھا گیا ہے۔''۶۷؎

(پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ص، ۹۴)

برہمن لاہوری کی سنہ پیدائش تقریباً ۱۰۲۳ھ یعنی ۱۶۱۵ء میں ہوئی۔ مگر برہمن کی کلیات میں ان کی تاریخ ولادت ۹۸۲ھ لکھا ہے لیکن برہمن لاہوری نے دیوان افضل خان میں ایک مکتوب تحریر کی تھی جس میں انہوں نے اپنی عمر پچاس سال بتائی ہے۔ اس عمر کے مطابق

۱۰۲۳ھ ٹھیک نظر آ رہا ہے۔ چندر بھان برہمنؔ نے ابتدائی تعلیم ملا عبدالکریم چشتی لاہوری سے حاصل کی اور علوم وفنون کی چند کتابیں بھی ملا عبدالکریم سے حاصل کی تھی۔ فارسی اور عربی زبان کے علاوہ سنسکرت کے ساتھ کافی لگاؤ تھا۔ شعر وانشاء میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ یہ ان کو وراثت میں ہی ملا تھا کیونکہ برہمن کے والد دھرم داس ایک فاضل و تجربہ کار انشاء پرداز تھے۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی برہمنؔ لاہوری نے میر عبدالکریم داروغہ عمارات دولت خانہ دارالسلطنت کے پاس ملازمت اختیار کی۔ شعروادب کے ساتھ پہلے سے دلچسپی رکھتے تھے۔ شاعری سیکھنے کے لیے انہوں نے قدماء کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔ دیوان کل افضل خان کے دربار میں برہمنؔ کو اعلیٰ مرتبہ ملا اور مصاحبین میں شامل ہونے لگا۔ یہ وقت چندر بھان برہمنؔ کے خوش قسمتی کا وقت تھا۔ کیونکہ افضل خان خود ادب شناس اور علم پرور شخص تھے اور علماء و ادباء کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ برہمنؔ لاہوری کے ساتھ افضل خان کو بہت رثوق تھا۔ وہ برہمنؔ کو بہت عزت کرتے تھے۔ برہمنؔ لاہوری کی اتنی قدر افزائی ہوئی کہ اس مسودہ فرامین کی تحریر کے لیے مخصوص انعام مقرر کیا گیا۔ برہمنؔ لاہوری کر شکستہ نویسی میں بہت مہارت حاصل تھی۔ نستعلیق کا بھی ماہر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ برہمن نے کچھ ہی وقت میں ملازمت کر کے اس کو خیر باد کہہ دیا۔ اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ افضل خان کے دربار میں برہمنؔ لاہوری کے شعراء وعلماء کی صحبت حاصل ہوئی تھی۔ جس طرح مولانا رومیؔ نے ایک شعر لکھا۔

صحبت صالح ترا صالح کند　　　　صحبت طالح ترا طالح کند

اسی طرح چندر بھان برہمنؔ پر نیک لوگوں کی صحبت کا اثر پڑھ گیا۔ اس صحبت سے برہمنؔ کا ادبی شعور بہت پختہ ہو گیا۔ افضل خان کے انتقال کے بعد برہمن لاہوری عاقل خان کے دربار سے منسلت ہو گئے۔ اس کے بعد مولف نتائج الافکار کے مطابق انہوں نے اکبر خان شیرازی کی ملازمت بھی اختیار کر لی تھی۔ جس کے دربار میں مبارک کے مواقع پر برہمنؔ نے یہ رباعی بیان کی۔

شاہی کہ مطیع او درعالم گردد　　　　ہر جا کہ سر بست بردوش خم گردد

ازسبکہ بدرش آدمی یافت شرف　　　　خواہد کہ فرشتہ نیز آدم گرددـ۶۸

(نتائج الافکار، ص،۱۰۶)

حاکم شیرازی نے برہمن کی رباعی کو بہت پسند کیا اور اس کو واقعہ نویسان حضور میں شامل کرلیا۔اس کے علاوہ شاہی نسخے کی تحریر کا کام سپرد کیا گیا۔ وہاں پر برہمن لاہوری نے مختلف سفروں اور مہموں کا حال درج کیا۔شاہجہان بھی برہمن لاہوری سے بہت قدر افزائی کرتے تھے۔اور برہمن کو ''فارسی دان ہندوی'' کہہ کر پکارتے تھے۔جس طرح جشنوں،تہواروں اور دوسرے مبارک دنوں پر دوسرے شعراء اشعار پیش کرتے تھے۔اسی طرح برہمن روایتی طور پر رباعیاں پیش کرتے تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برہمن لاہوری کو دوسرے اصناف کی طرح رباعی گوئی کے ساتھ کتنا لگاؤ تھا۔شعر وادب کی وجہ سے برہمن لاہوری کی قدر ومنزلت اتنی بڑھ گئی کہ شہزادہ داراشکوہ نے ان کو اپنے دربار میں خود طلب کیا اور میر منشی کی حیثیت سے مقرر ہوئے تھے۔اور برہمن لاہوری کو قندہار کی مہم پر اپنے ساتھ لیا گیا۔ داراشکوہ کی شکست کے بعد انہوں نے اورنگ زیب کی تخت نشینی پر اور اس کے دوسرے امراء کی خدمت قبول کرلی۔اس وقت برہمن لاہوری نے مندرجہ ذیل رباعی مبارک باد کے طور پر پیش کردی۔

شاہا عالم مطیع فرمان تو باد　　　لبریز دائی شکر احسان تو باد
چون ذات تو خلق رانگہبان باشد　　　ہر جا باشی خدانگہبان تو باد۶۹

(منشات،ص،۱۱۔۱۰)

کچھ وقت دربار میں رہ کر برہمن لاہوری نے بزرگی کی وجہ سے سبکدوشی اختیار کی۔ بعد میں برہمن کو مقبرہ جہانگیر کی نگہداشت کا کام سونپ گیا۔کچھ محققین کے مطابق برہمن لاہوری کا انتقال ۱۰۷۳ھ میں بنارس میں ہوا۔لیکن بہت تذکرہ نگار اس تاریخ وفات پر متفق نہیں ہے۔کلمات الشعراء اور تذکرہ حسینی کے مطابق ۶ جلوس میں مقبرہ جہانگیر میں ایک مجلس کا انعقاد ہوا جس میں برہمن لاہوری کا ذکر موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۷۳ھ تک برہمن لاہوری زندہ تھے اور لاہور میں مقیم تھے۔اسی وقت کا ایک اور واقعہ تذکرہ شعرائے پنجاب میں موجود ہے۔ کہ ایک دن برہمن لاہوری نے داراشکوہ کی خواہش پر بادشاہ کے سامنے یہ شعر پڑا۔

مرا دلی بکفر آشنا کہ چندین بار   بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

کہا جاتا ہے کہ اس شعر پر شاہجہاں بہت ناراض ہو گئے اور اس نے حکم دیا کہ برہمن بد بخت شاعر کو قتل کرنا چاہئے۔ اس موقعہ پر افضل خان نے سعدی شیرازی کا یہ شعر پڑا۔

خرعیسیٰ اگر بہ مکہ رود   چون بہاید ہنوز خر باشد۔ ۷۰

(کلمات الشعراء، ص، ۲۱۹)

اس شعر سے شاہجاں کی ناراضگی دور ہوگئی اور برہمن لاہوری کو بچالیا گیا۔ لیکن ڈاکٹر ظہور الدین احمد، مصنف پاکستان میں فارسی ادب نے اس واقعہ کی خوب تردید کی تھی۔ ان کے مطابق پہلے بادشاہ برہمن کو بہت پسند کرتے اور ایسے واقعات سے تحقیر کا پہلوں نکلتا ہے۔ اکثر نظر میں آتا ہے کہ برہمن ہندوں شاعر ہونے کے سبب اکثر تذکرہ نگار اس کے تیں مختلف ہے۔

چندر بھان برہمن کی شاعری کا جہاں تک سوال ہے وہ طبعیتاً سلیم مزاج کے آدمی تھے۔ صوفیت اور صلح کل زیادہ ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔ نیک بصیرت شخص تھے۔ اپنے آپ کو حقیر سمجھتے تھے۔ مسلم اور ہندوانہ مراسم کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ کرتے تھے۔ برہمن لاہوری کے متعدد تصانیف و تالیف ہیں۔ جن کا تعارف حسب ذیل ہے۔

(۱) منشات برہمن: یہ سرکاری اور نجی تحریروں کا مجموعہ ہے جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں امراء اور وزیر، ارباب فقیر و فضل اور ادباء و اقربا کے بارے میں ذکر موجود ہے۔ ۱۲۸ خطوط پر تحریریں موجود ہیں۔ ان سے اخلاق اور کردار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہیں۔

(۲) مثنوی ہفت بحر: یہ مثنوی ۱۸۸۵ء میں نولکشور کی جانب سے مثنوی رائے چندر بھان کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کا موضوع اخلاق اور تصوف ہے۔

(۳) دیوان: برہمن کا دیوان بھگونت رائے بہار سنامی کے مرتب مجموعہ گلزار بہار میں شامل ہے۔ اس کے دیوان میں غزلیات موجود ہے اور کلیات میں رباعیاں موجود ہے اس کے علاوہ تین وصائد اور ایک مثنوی بھی موجود ہے۔

(۴) نادر النکات: یہ کتاب رائے جادو داس نے بابا لال جوگی کے سوال و جواب کا مجموعہ قلم

بند کیا ہے۔ بعد میں برہمن لاہوری نے اسی کو فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔
(۵) چار چمن: یہ برہمن لاہوری کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے جو نجی زندگی سے اس کے منصب سے مطلق سفروں کے مشاہدات وغیرہ پر مبنی ہے۔
(۶) تحفتہ الصفحا: یہ بارہ اوراق پر مشتمل شعراء کا مختصر سا تذکرہ ہے۔ جس میں دو تین سطروں میں ۱۴۰ شعراء کا تعارف شامل ہے۔ یہ کلیات برہمن موسوم بہ گلزار بہار میں شامل ہے۔
(۷) طغرائے شاہجہانی: یہ کتاب عہد شاہجہانی سے متعلق ہے اس کتاب میں تقطیع ۲۸ صفحات پر لکھی گئی ہیں۔
بہر حال برہمن لاہوری شروع سے ہی صوفی مزاج کے آدمی تھے شاعری کے موضوعات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ امر سامنے آتا ہے کہ انتخاب موضوعات میں بھی شاعر کی فطری روایت کارفرما رہی ہے۔ شاعر نے قدماء کی روایت کی پیروی کرتے ہوئے ان سب موضوعات کو اپنے کلام میں سمیٹا ہے۔
کلمات الشعراء میں چندر بھان برہمن کی شاعری کے بارے میں یوں ذکر موجود ہے

> ''طبعی درست داشت شعر بہ طرز قدما، شستہ وصاف می گفت ، وسلیقہ انشا پردازی درست نیز داشت در ہندوان غنیمت بود'' ۱؎

(کلمات الشعراء، ص ۱۶)

ڈاکٹر سید عبداللہ برہمن کی شاعری کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

> ''برہمن ہندوؤں میں بہترین اور پہلا باکمال شاعر تھا'' ۲؎

(ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ۸۱)

محمد صالح کنبوہ نے برہمن کے بارے میں لکھا کہ اس کی آنکھوں سے شعر پڑھتے ہوئے آنسو رواں ہو جاتے تھے۔ ۳؎

(عمل صالح، ص ۴۳۴، ج ۳)

برہمن لاہوری کے معاصرین میں منیر لاہوری جو اپنے زمانے میں بالغ تنقیدی شعور کے لیے معروف ہے۔ برہمن کی تعریف کرتے ہوئے اس سے مخاطب کر کے کہا ہے۔

سخن اندیش وخرد پرور ومعنی آرای ۴؎ نیست درخط اندیشہ وری چون توکس

(انشائی منیر، ص، ۱۵)

برہمن لاہوری کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شاعری بنیادی طور پر تصوف کی شاعری ہے۔ برہمن ہندوؤں میں اولین صوفی شاعر کی حیثیت سے ابھرے ہیں۔ چاہے اس کی غزل ہو یا اس کی رباعیات ہو ومثنوی سب اصناف ادب میں تصوف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔قناعت، استغناء، صبر، رضا، ترک علایق دنیوی، لہو وہوس سے پرہیز، تزکیہ نفس، توبہ، اشکباری، گریہ زاری، اخلاقیات اور فلسفہ برہمن کے کلام کے عمومی موضوعات ہیں۔اگرچہ برہمن ہندوں تھا لیکن توحید خدا پرست تھا۔تقدیر کا قایل اور حشر ونشر پر بھی یقین رکھتا تھا۔

برہمن لاہوری نے شاعری میں وہ طریقہ اختیار کیا جو فارسی کے مسلم الثبوت شعراء نے اپنی شاعری کا جزو بنایا ہے۔ برہمن لاہوری کے دل میں روایتی شاعری کا پورا احترام موجود ہے۔ان کے غزل کے موضوعات بہت وسیع اور گونا گونی کے مظہر ہیں۔تصوف سے رندی و خمریات تک عشق حقیقی سے حسنِ مجازی کی رنگینیوں تک نغمہ توحید سے عظمت انسانی کے زمزمے تک ،غرض ارض و سما کی وسعت اور اس کی موجودات کا ذکر برہمن کی شاعری میں موجود ہے۔ دوسرے شعراء کی طرح برہمن بھی وحدت الوجود کا قائل ہے اس کا خیال ہے کہ مظاہر جو بھی ہوں اگرچہ منبع برہمن لاہوری کے سامنے بہت کچھ آتا ہے لیکن پوشیدہ حقیقت ایک ہی نظر آتی ہے۔ چند اشعار مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

گل یکی، خار یکی شاخ یکی تاک یکی است

نزد ارباب نظر ہر خس وخاشاک یکی است

درخود قامت ہر مرد بود جامہ در است

لیکن آن جامہ کہ دو زند پیئی چاک یکی است ۔۵؎

(پنجاب کے برگزیدہ غزل گو)

شاعر کے نزدیک نیک و بد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ دونوں خالق کی مخلوق ہے البتہ نیک لوگ ہی اپنے محبوب حقیقی کا جلوہ دیکھ سکتے ہے۔ برہمن کی ہمدردی، گداز و دقت کا

ایک مظہر دل شکستہ کی ترکیب ہے۔اس نے دل شکستگی کو قرب الہیٰ کا وسیلہ اور رحمت باری تعالیٰ کے جوش کا محرک قرار دیا ہے۔

چوں سر از رشتہ توحید برآرند ہمہ　　　پیشِ ارباب نظر عاقل و دیوانہ یکست

ہر صدف گوہر و ہر بحر خروشی دارد　　　پیش ارباب نظر گر ہر تابندہ یکست

شاعر اپنے آپ کو توحید خدا سے مست اور محمور قرار دیتا ہے۔نمونہ کے طور پر دو اشعار پیش کرتا ہوں۔

مرد آزماست بادہ توحید برہمن　　　نا آزمودہ مست بیک جام می شوی

خیال عنبر او در دل نمی گنبد برہمن را　　　شود بیگانہ از خود ہر کہ یاد آشنا باشد

برہمن لاہوری یادِ خدا کی محبت اور عشق کے طلب گار نظر آتے ہے۔برہمن زادہ ہوتے ہوئے اس کی فکر و تخیل اسلامی اقدار پر استوار نظر آتا ہے۔تصوف کی منزلیں،عشق حقیقی کے مراحل کسی مسلمان شاعر ہی کی اس کے اشعار کا موضوع دیکھنے کو ملتا ہے۔شاعر کا بچپن سے لے کر جوانی تک کا زمانہ عشق مجازی اور دنیا کی چاہ و محبت میں بادہ و جام کے ساتھ نشاط و کیف اور سرور میں بسر ہوا تھا جس کا وہ خود اعتراف کرتا۔اب ہمیشہ وہ محبوب کے وصال کا منتظر رہتا ہے۔غزل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

ہمیشہ زلف ترا اضطراب درکار است　　　چگونہ جمع کنم خاطر پریشان را

مرنفس بوی محبت آید از گفتار ما　　　می توان فہمیدہ از گفتار ما مقدار ما

ہر چند پا کشیدہ روم پیشتر رود　　　باز این دل رمیدہ بکوئی کہ آشناست

در میکدہ عشق باندازہ خود باش　　　چون مستی این جرعہ باندازہ ہوش است۔۶ے

(تذکرہ شعرائے پنجاب،ص،۵۷)

چندر بھان برہمن نے اصناف سخن غزل،مثنوی،قطعہ کے ساتھ ساتھ رباعی گوئی کی طرف بھی توجہ مبذول کر لی تھی۔اس کے عہد میں زیادہ تر رباعی گوئی سے مجلس سجاتے تھے اس لیے برہمن لاہوری نے روایت کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی۔

برہمن کی رباعی کئی لحاظ سے اپنے معاصرین سے منفرد ہے اس کے ہاں سبک ہندی کی

مضمون آفرینی ،اغراق و پیچیدگی نظر آتی ہیں۔ان کے فارسی رباعیات میں تصوف اور حکیمانہ طرح کے مضامین ملتے ہیں۔بادشاہوں اور امیروں کی محفلوں کو صوفیانہ رباعیوں سے زینت دیتے ہیں۔اس وقت کے صوفی شاعر شیخ رزق اللہ دہلوی اور جمالی تھے۔جنھوں نے عشق حقیقی کے بکثرت مضامین رباعیات کی شکل میں نظم کئے ہیں۔ان کا سیدھا اثر برہمن کے کلام پر پڑ گیا۔شاعر کے رگ رگ میں عشق حقیقی پیوست ہو چکا ہے۔وہ حقیقت میں ایک صوفی صادق تھے ان کے دل پر جو واردات طاری ہوتے تھے ان کو برہمن شعر کا جامہ پہنا دیتے تھے۔مثال کے طور پر یہ رباعی پیش کرتا ہوں۔

آنان کہ زعشق رنگ و بوئی دارند　　　درگلشن عیش آبروئی دارند

چون غنچہ بہ صد زمان خوش اند ہمہ　　　در پردہ بخوش گفتگوئی دارند۔۷۷

(گُلِ رعنا،ص،۸)

متصوفانہ نظریات میں سے ایک اہم نظریہ عشق کا ہے شاعر کا دل مئی عشق سے سرشار ہے ۔وہ بلند پایہ کے عاشق تھے اور اپنے آپ کو سدرۃ المنتہٰی کی رفعتوں سے ہمکنار کرنے کا آرزومند ہے۔شاعر کے عشق میں سوز ،سچائی اور تڑپ موجود ہے۔عشق حقیقی نے برہمن کو قوت پرواز اور بلند نگہی بخشی ہے۔برہمن لاہوری کے مطابق عشق ایک لطیف جذبے کا نام ہے اس میں کثافت راہ نہیں پاسکتی جہاں عشق ریاکاری سے منع کرتا ہے اور قول وعمل میں مطابقت کی تعلیم دیتا ہے۔وہیں یہ فاش گوئی ،لن ترانی اور ریاوہ گوئی کا بھی سخت مخالف تھا۔عشق چونکہ خود لطیف ہے۔اس لیے اس کے اظہار کے وسائل بھی لطیف ہونے چاہیں۔عشق راست بیانی کے بجائے رمز یہ انداز گفتگو کا قایل ہے۔یہاں ابرو کے ایک اونے اشارے سے دنیا تہ و بالا ہو جاتی ہے۔برہمن لاہوری نے خمریہ رباعیاں بھی لکھی تھی۔یہ رباعیاں دوسرے شعراء سے مختلف ہیں۔ان میں تھوڑا سا سرور پایا جاتا ہے۔وہ میخانے اگر جاتے بھی ہیں۔تو دلق ریا کو اتار کر پھینک دینے کے لیے جاتے ہیں ایک خوددار شرابی کی حیثیت سے جاتے ہیں۔خود ساقی سے بادہ طلب کرتے ہیں۔یہ رباعی بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔

(۱) ساقی چہ طرفہ ساقی بد بخت بودہ ای　　　می ریختی ساغر و ساغر شکستہ ای

سیراب یا دگلشن ہمت کہ برہمن   لب وتشنہ بام برلب کوثر شکستہ ای

☆☆☆

(۲)من کیستم از راہ درازآمدہ ای   درعینِ حقیقت بہ مجاز آمدہ ای

ازمیکدہ عشق درین دیرکہن   صدبار برون رفتہ وباز آمدہ ای۔۸ے

(تذکرہ شعرائے پنجاب،ص۷۲۔۷۷)

تصوف کے اظہار کا دوسرا رخ اخلاقیات ہے۔خدا دوست صوفی کیے لیے با اخلاق انسان ہونا بھی ضروری ہے۔ مجھے بابا فرید کا ایک شعر یاد آیا ہے۔

انسان راانسان لازم است   عود را گر بونہ شد ہنزم است

برہمن کے کلام میں مختلف اخلاقی اقدار کی پیروی کی تلقین موجود ہے۔ بالخصوص دنیا اور علایق دنیا سے اجناب یعنی دینا میں رہتے ہوئے اس کی آلودگیوں سے اپنا دامن بچانا ہے۔ برہمن لاہوری نے مذہبی رباعیوں کے ذریعے ان سماجی برائیوں سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ ہمیشہ حقیقت کوساتھ دیا۔ان کے مطابق حق الگ چیز ہےاور بت پرستی الگ چیز ہے۔

مارا ز می شبانہ مستی دگراست   وارستگی ز قیدِ ہستی دگر است

ما برہمنیم لیک در مذہب ما   حق دیگر وشغل بت پرستی دگراست۔۹ے

(تذکرہ شعرائے پنجاب،ص ۷۲)

☆☆☆

درجہان باش ولیکن زجہان بارغ باش   ہرکہ فارغ از جہان ہست جہانی بااوست

برہمن لاہوری کو اپنے مذہب پرفخر ہے اس کے باوجود ہاں خالص توحید کا واضع تصور موجود ہے۔اس کے مطابق خدا کی ذات ہی انسان کو کامیابی تک لے جاسکتی ہے۔ برہمن لاہوری نے مذہبی رباعیوں کی طرح مدحیہ رباعیاں بھی لکھی ہیں۔احترام اور مہمان نوازی کی اہمیت کو بھی رباعیوں کے ذریعے بیان کیاہے۔بعض رباعیات اس وقت کے ماحول کو پیش کرتی ہیں۔

(۱) ای خواجہ نہ نام ونشان خواہد ماند   حرفی دوسہ برسرزبان خواہد ماند

ہر چیز کہ ہست از مہمان خواہد رفت　　جز نام خدا کہ درمیان خواہد ماند

(۲) ای آنکہ بدیدہ آشنا می آئی　　دل بردہ زدست ودلبر با می آئی

جائی نگذاشتم کہ پی می باشی　　با این ہمہ عشوہ از کجا می آئی۔۸۰؎

(تذکرہ شعرائے پنجاب، ۷۷)

برہمنؔ لاہوری کی رباعیات سے ہم ان کے مقام کو سمجھ سکتے ہیں۔ کہ ان کا مقام بہ حیثیت شاعر کیسا تھا۔ خالی اسی پہلوں میں نہیں اگر ان کے دیوان کو سامنے رکھا جائے تو سر سے پاء تک بلند مضامین نظر آتے ہیں اگر چہ برہمنؔ کا عمومی لہجہ تصوف سے معمور ہے اور اس کے متصوفانہ اشعار سے اس کے مذہبی مسلک کی شناخت نہایت مشکل ہے البتہ اس نے جا بجا اپنے آپ کو زناردار کہہ کر یاد کیا ہے۔ جس سے اس کی مزہبی عقائد کا اظہار اور ان کے لاسخیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کچھ اشعار نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

بتار رشتہ زنار کردہ ام پیوند　　نظر بقاعدہ کیش ہرہمندارم۔

☆☆☆

ای برتر از تصور و وہم وگمان ما　　ای درمیان ما و برون از میان ما

درگاہ لطف تو جای سوال نیست　　اینجا چہ احتیاج بہ اظہار مدعا

چہ گونہ برہمنؔ از عشق احتراز کند　　کہ حسن جلوہ فروش است درزمانہ ما

ما برہمن حریف می ارغوان نہ ایم　　باشد ہمیشہ خون جگر درسبوی م

اشعارِ آبدار برہمنؔ چہ گوہر است　　پرکردم از جواہر معنی سفینہ ر۔۸۱؎

(پنجاب کے برگزیدہ غزل گو)

برہمنؔ لاہوری کا خیال ہے کہ عشق کے لیے بہت حوصلے کی ضرورت ہوتی ہیں۔ اور کئی امتحانوں سے گزرنا پڑھتا ہے۔ اس لیے عشق کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک عشق جنون بے خودی وخودسپردگی کا نام ہے اور اس میں غور وفکر کا مقام نہیں ہوتا ہے۔

محمد افضل سرخوش

اصلی نام محمد افضل اور سرخوش تخلص کے طور پر استعمال کرتے تھے۔تاریخ کے مطابق سرخوش کی پیدائش ۱۰۵۰ھ یعنی ۱۶۴۵ء میں کشمیر میں ہوئی ۔محمد طاہر نصرآبادی کے مطابق سرخوش کی ولادت لاہور میں ہوئی ۔لیکن بندرابن داس خوشگو نے ''سفینہ خوشگو'' میں اس کی تردید کرلی تھی اوراس نے یوں سرخوش کی تاریخ ولادت قلم بند کی۔

''میاں سرخوش پسرِ ثانی محمد زاہداست ولادت باسعادت او
درسال ہزارو پنجاہ بہ عہد شاہ جہانی در جنت نظیر کشمیر بود''۸۲؎

(سفینہ خوشگو،ص،۷۱۔۷۲)

سرخوش کے والدمحترم محمد زاہد شاہجہاں کے ہفت ہزاری امیر عبداللہ خاں کی سرکار میں میر سامان کے طور پر کام کرتے تھے۔اس کا تعلق برلاس قبیلے سے تھا۔شیر لودھی کے مطابق محمد زاہد کا تعلق مغل قبیلے سے تھا۔ بعد میں جدوآجداد بدخشاں سے ہجرت کر کے کشمیر داخل ہو گئے تھے۔کچھ سال سرخوش کی پرورش وہاں ہوئی اور وہ سرہند آ گیا تھا۔یہیں اس نے تعلیم وتربیت حاصل کی ۔بچپن سے ہی سرخوش کی طبعیت موزوں تھی ۔ یہاں سرخوش کو ناصرعلی سرہندی کی تربیت میں فیض حاصل کر کے ذہانیت میں اوراضافہ ہوگیا۔اس علمی ماحول سے سرخوش کا تعلیمی شوق اور بڑھ گیا تھا۔والدمحترم زاہد صاحب کے انتقال کے بعد گھریلوں ذمہ داری ان کے کندھوں پر سوار ہوگئی۔اس کے بعد ہی دوسرے بھائیوں کے ساتھ امیر عبداللہ خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔امیر خاں کے وفات کے بعد سرخوش شاہی دربار میں اعلیٰ منصب پر مقرر ہو گئے ۔کارخانہ جات کا انچارج بھی رہا تھا۔اس کے بعد ۱۰۷۸ھ حسن ابدال نے سرخوش کو مشرف عدالت مقرر کیا۔جس کی تاریخ اس نے اشرف عدالت سے نکالی ۔معلوم ہوتا ہے کہ اس تعیناتی سے پہلے بھی اس کی مالی حالت اچھی تھی ۔ مالی استواری کا انداز اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ۱۰۷۱ھ اور ۱۰۷۲ھ میں اس نے دہلی میں دو مکان تعمیر کرائے تھے۔بہرحال اقتصادی حالت کو اور بہتر بنانے کی خاطر سرخوش نے اورنگ زیب کی وفات کے بعد بھی فرخ

سپر کے دربار میں بھی ملازمت کی۔ اس عہد میں وہ صوبہ اجناس مندرس کی تحویلداری پر فائز تھا۔ بزرگی کے ایام میں سرخوشؔ گوشہ نشین ہوگئے اور اکثر و بیشتر عوام کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ اسی دوران محمد افضل سرخوشؔ نے ایک مسجد تعمیر کرائی جس کی تاریخ مندرجہ ذیل قطعے سے نکلتی ہے۔

چون گفت زفضل ایزد عزوجل	آراستہ این مسجد برزیب وخلل
اندیشہ زطبع سال نامش خواست	دل گفت کہ ''مسجد محمد افضل'' [۸۳]

(کلمات الشعراء، ۱۶۵)

بزرگی کے ایام میں ہی سرخوش کو آنکھوں کی بینائی کم ہوگئی اور اسی دوران سراج الدین خان آرزو ان کے پاس ملاقات کی غرض سے آئے۔ ملاقات کا ذکر خان آرزو یوں کرتا ہے۔

> ''فقیر آرزو در اوائل سلطنت محمد فرخ سید بادشاہ شہید مرحوم در خدمت او رسید، چون از حلیہ بصارت درآں وقت مردم چشمش عاری شدہ۔ دیوان خود را بہ فضل اللہ نام پسر خود کہ دبعد از وشعر می گفت و ہنر تخلص می نمود و در عین شباب جہان گذاران را اوداع نمود دار کہ پیش فقیر بخواند'' [۸۴]

(پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ص ۱۰۸)

معروف شاعر نے مرتبے اور قطعے کی تاریخ رقم کی۔ سرخوش کی شادی محمد ہاشم کی لڑکی سے ہوئی۔ جو ایک ماہر خوشنویس اور شاعرہ تھی۔ اس سے سرخوشؔ کے دو لڑکے ہوئے۔ بدقسمتی سے بڑے لڑکے کی وفات سرخوشؔ کی زندگی میں ہوگئی۔ چھوٹے لڑکے کی پیدائش ۱۰۹۴ھ میں ہوئی۔ اور ان کا بھی انتقال جلدی یعنی ۱۱۴۱ھ میں ہوا۔ وہ بھی اچھا شاعر اور خوش نویس تھا اور خوشتر (بعد میں ہنر) تخلص رکھتا تھا۔

سرخوشؔ کے اخلاق و ادب کا جہاں تک سوال ہے۔ بہت قلب سلیم اور ہمدرد شخص تھے۔ لاہور سے دہلی تک سرخوشؔ کا میدان بہت وسیع تھا۔ اکثر دوستوں کے ساتھ اس کے بے تکلفی کے تعلوقات رہے تھے۔ شروع سے ہی صوفیت کا شغف ان پر سوار تھا۔ ایک بزرگ

صوفی نظام الدین طالع کی بیت کی تھی اور انہیں نظام الدین اولیاء کہا کرتا تھا

ان کے علاوہ دوسرے صوفی شاہ جلال کے ساتھ سرخوشؔ کی گہری وابستہ گئی تھی۔صوفی شاہ جلال کے انتقال کے بعد سرخوشؔ کو ان کا خلیفہ مقرر کہا گیا سرخوشؔ کو اپنے صوفی ہونے پر ناز تھا۔خوشگو نے اس کی یہ نقل کی ہے۔

چار اندز تحقیق کمبیائی آ گاہ　　　　این عربی اول شان درافواہ

پس مولوی وسحابی وملا شاہ　　　　پنجم سرخوش غریب اللہ اللہ ۸۵؎

(خوشگو،۱۷)

حکمرانوں کے ساتھ بھی سرخوشؔ کو اچھے تعلوقات تھے۔اہم موقعوں پر وہ ان کے لیے مدح یا تاریخ کہا کرتا تھا۔اگر کہیں سے خاطرخواہ جواب نہ ملتا تو اس کی ہجو سے بھی گریز نہ کرتا۔ سرخوشؔ نے کلمات الشعراء میں جن امراء سے تعلوقات کا ذکر کیا ہے ان میں ہمت خان، عاقل خان رازی، بختاور خان ابوعلی امجد بخشی، شیخ سعد اللہ، حافظ نور محمد میر سامان اور کوہر آرا بیگم کے نام نظر آتے ہیں۔۸۶؎

(کلمات الشعراء، ص ۲۸۔۲۹)

اس عہد کے شعراء میں ناصر علی سرہندی کے ساتھ سرخوشؔ کو بچپن سے ہی اچھے روابط تھے۔دونوں ایک دوسرے کی قدر افزائی کیا کرتے تھے۔بعد میں میر معز کے ساتھ بھی دوستانہ تعلوقات قائم ہوئے تھے۔میر معز کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں صرف تین شاعر اس وقت موجود ہیں۔اول غنی کشمیری، ناصر علی سرہندی اور محمد افضل سرخوشؔ۔اس وقت بیدلؔ اور ناصر علی سرہندی کے آپسی اعتراضات تھے۔ ناصر علی ہی سرخوشؔ کو بیدلؔ کے بارے میں اکساتے تھےؔ۔جس کی بدولت بیدل کا انداز بدل جاتا ہے۔سرخوشؔ اکثر ان کے مصرعوں پر تضمین لکھ دیتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ سرخوش اور بیدل کے آپسی بہت شاعرانہ مقابلے اور معرکے رہے تھے۔کچھ مدت کے بعد بیدلؔ اور سرخوشؔ کے تعلوقات مضبوت اور استوار ہو گئے تھے۔اور بیدلؔ نے بعد میں سرخوش کے دیوان میں اصلاح کی ہے۔یہی اصلاح کردہ دیوان مدراس کے موزیم میں موجود ہے۔

تصانیف سرخوش: سرخوشؔ اگرچہ اپنے تذکرہ کلمات الشعراء کی وجہ سے مشہور ہوا لیکن اس کے علاوہ ایک پرگو شاعر گزرا تھا۔اس کی تصانیف و تالیف کا مختصر تعارف مندرجہ ذیل پیش کرتا ہوں۔

(۱) دیوان: سیفینہ خوشگو کے مطابق سرخوشؔ کا دیوان میں ۴۵۰۰۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور گل رعناء کا بیان ہے کہ یہ دو دیوان تھے ایک قدیم یا کلاسکی دوسرا جدید طرز پر لکھا ہے اس حصہ میں غزلیں، رباعیاں، قصیدے اور چھ رباعیاں و کچھ متفرق اشعار موجود ہیں۔ایک دیوان سرخوش نے خود مرتب کیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا کہ یہ دیوان ناصر علی، فطرت اور غنی کشمیری کے دیوان سے مختصر ہے۔خودنوشت دیوان کا نام ''منتخب کلیات سرخوش'' رکھا ہے۔ یہ ۱۱۰۴ھ میں مکمل ہوا۔سرخوش کے دیوان میں نثری دیپاچہ بھی موجود ہے علاوہ دیپاچہ میں غزلیات، رباعیات اور مخمسوں کا انتخاب ہے۔

(۲) نورِ علیٰ نور: یہ مثنوی سرخوشؔ نے مولانا رومی کی معنوی کے سبک میں ہے۔اس مطلع سے شروع کی ہے۔

شیشہ از قلقل حکایت می کند غمزہ ساقی روایت می کند

(۳) حسن و عشق: یہ رومانی طرز کی مثنوی ہے۔سسی پنوں کے واقعات پر مشتمل ہے مثنوی کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

الٰہی سوزش دردم فزوں کن نمک دانی بداغم سرنگوں کن

(۴) ساقی نامہ: یہ قصیدہ ہمت خان کے لیے لکھا گیا۔ یہ سرخوشؔ کا رنگین مجموعہ ہے۔

سر زلف واکردہ سنبل بہ ناز شدہ از مریداں گیسو دراز ۸۷

(سفینہ خوشگو، ۷۶)

(۵) کلمات الشعراء: اس تذکرے میں تقریباً دوسو شعراء کا حال مختصراً بیان کیا گیا ہے۔ جو اکثر جہانگیر سے اورنگ زیب کے عہد تک ابھرئے۔ان میں سے بہت شعراء کا حال سرخوشؔ نے خود لکھا ہے لیکن اشعار بعض اوقات محمد علی ماہرؔ، میر معز فطرتؔ اور محمد زمان راسخ کی بیاضوں سے نقل کیئے ہیں۔بیش تر شعراء سرخوشؔ کے معاصرین تھے۔اور ان میں متعدد شعراء کے ساتھ

سرخوشؔ کی ملاقات بھی ہوئی ۔لہذا اس تذکرے کے بیانات بہت اہمیت کے حامل ہے۔ مآخذات کا بھی حوالہ نہیں دیا۔اپنے حالات بھی ایک ہی جگہ نہیں لکھے۔ بلکہ ساری کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں۔ان میں خودستایش کا اندازہ نمایاں ہے۔ ہرمعروف شاعر کے تتبع میں کہے ہوئے اپنے شعر نقل کیے ہیں۔اس کے علاوہ چند ایرانی شعراء جو ہندوستان نہیں آئے تھے۔لیکن سرخوشؔ نے شہرت کی بنا پر ان کو تذکرے میں شامل کر دیا۔ بہرحال سرخوشؔ نے کتاب کے دیباجے میں یہ دعوا کیا ہے۔

ہر کہ نامش نہ بود در کلمات شعراء　　　　داخل اہل سخن نیست بہ بیش دانا

اس کے علاوہ مثنوی قضا وقدر، جنگ نامہ اور ایک مثنوی در خصوصیات ہندوستان قابل ذکر ہے۔ جنگ نامہ کو اعظم شاہ کے تعریف میں لکھا گیا ہے۔

برنگ تن و ہر دو دندان او　　　　بگویم چہ رمزاست ای راز جو

ظفر را پی دولت پادشاہ　　　　دراز است در شب دوست دعا۸۸؎

(سفینۂ خوشگو،۷۶)

سرخوشؔ کے شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اگر چہ سرخوشؔ تذکرہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہے مگر شاعری کے میدان میں کسی دوسرے شاعر سے کم رتبہ نہیں رکھتے۔اپنی شاعری پر سرخوشؔ ناز کرتے تھے۔عمرِ عزیز کے آٹھ سال سے ہی سرخوشؔ نے شاعری پر طبع آزمائی کی ۔ یہ چیز بھی شاعر کے معیار کو ثابت کرتا کہ پہلے ہی رباعی گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ پہلا شعر جو زبان سرخوشؔ سے نکلا ہے وہ درجہ ذیل پیش کرتا ہوں۔

بر از غذان تو حالی سہی افتاد است　　　　ہم جو پویست کہ بالای چہی افتاد است

یہ شعر اپنے بھائی خیر الدین کو سنایا تھا انہیں شعر سن کر بہت تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی محسوس ہوئی تھی۔سرخوشؔ نے اپنے بھائی کا منھ چوم لیا تھا اس وقت سے سرخوشؔ نے مسلسل طور پر شاعری کو جاری رکھا۔ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ تقریباً ہر شاعر نے زندگی کے آخر میں رباعیات کے پہلو جلوہ نما کیا لیکن شاعرِ موصوف نے گیارہ سال کی عمر میں ہی اس باب کا باضابطہ آغاز کیا۔پہلی رباعی جو شاعر نے نٹنی کو رسی پر چڑھے دیکھ کر لکھی۔درجہ ذیل پیش کرتا

ہوں۔

آن دلبر بوالعجب کہ ماہ زیباست　　　بالائی علم چوگل بشاخ رعناست

نی نی غلطم کہ آفتاب محشر　　　یک نیزہ برآمد وقیامت برپاست ۸۹

(کلمات الشعراء، ص،۱۰۴)

اس رباعی سے معلوم ہوتا ہے کہ سرخوشؔ پہلے سے ہی کتنا ذہین شخص تھا۔ رباعی فکر کی بلیغ اظہار کا نہایت موثر ذریعہ ہے۔ سرخوشؔ کے لیے یہ صنف نہایت موزوں رہی۔ کیونکہ اس نے شعروادب میں فنکارانہ حیثیت سے کام کیا۔ شاعر نے اپنے وسیع خیالات کو اظہار کرنے کے لیے رباعی کو وسیلہ بنایا تھا۔ مذکورہ رباعی لوگوں میں معروف ہوئی کہ لوگ سرخوشؔ کے والد کو مبارک باد دینے کے لیے آئے تھے۔ سرخوشؔ نے شروع سے ہی حافظ شیرازی اور بیخود جامی کی پیروی کی تھی۔ حتیٰ محمد افضل کو سرخوشؔ کا تخلص بیخود جامی نے ہی دیا ہے۔ اور بیخود جامی نے ہی ان کو محمد علی ماہرؔ کے دربار میں لیا تھا۔ محمد علی ماہرؔ سرخوشؔ کو بہت قدر افزائی کیا کرتے تھے۔ سرخوشؔ نے بھی اپنے دیوان میں ان کی حق ادا کی ہے۔

''فقیر در جوانی مدتی شعر را در خدمتش گدا بندہ واصلاح گرفتہ بود۔ روزی در مجلس شعرخوانی فقیر این مطلع تازہ برخواندم۔

کی تواند دید زاھد جام صبا بشکند

می پردنگم حبابی گو بدریا بشکند

ہمہ صاحبان سخن زبان آفرین وتحسین کشودند، حکیم صاحب تا نصف شب ہمینی مطلع برزبان داشت ومیگفت سبحان اللہ در ہندی مردی پیدا شد کہ چنین شعر گوید'' ۹۰

(کلمات الشعراء، ص ۱۶۸)

میر معز موسوی خان فطرتؔ اگرچہ سرخوشؔ کے استاد نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی وہ ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بچپن سے ہی خوش اخلاق تھا اور یہی اثر ان کی شاعری میں بھی

نمایاں نظر آتی ہیں۔ان خصوصیات کی بنا پر اگر سرخوش کو خوش فکر اور مفکر کہا جائے تو بجا نہ ہوگا۔حلقہ ادب میں سرخوشؔ کو احترام کرتے تھے۔ بہت نو جوان طبقہ کے شاعر اپنا کلام سرخوشؔ کو اصلاح کے لیے دیکھاتے تھے۔ان میں حکیم چند ندرت ،محمد یوسف قدیم ، حافظ محمد جمال تلاش، شیخ سعد اللہ گلشن اور بندرا بن داس خوشگو کے نام قابلِ ذکر ہے۔91

(کلمات،۹۔۴)

پہلے ہی سرخوشؔ کے بارے میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ انہوں نے غزل، رباعی ،مثنوی و غیرہ اصناف سخن میں ناموری حاصل کی۔غزلیات کے ساتھ ساتھ رباعیات کا پہلوں بہت تابناک نظر آتا ہے۔ پورا کلام اگرچہ دستیاب نہیں ہے مگر جو اشعار کلمات الشعراء میں موجود ہے یا باقی کلام جو دیگر محققین نے جمع کیا ہے اس سے یہی اخذ ہوتا ہے کہ سرخوشؔ مستوسطہ درجہ کے رباعی گو شاعر تھے۔شرخوشؔ کے کلام میں تنوع مضامین بہت کم ملتے ہیں ۔سوچ وفکر پر شاعر زیادہ توجہ دیتے تھے۔تصوف ان کی شاعری کا خاص پہلو ہے۔صنعت گری کے جوہر ان کے فارسی کلام میں موجود ہے۔مثلاً

چار اند ز تحقیق کما ہی آگاہ	ابن عربی اول شاں در افواہ
پس مولوی وسحابی وملا شاہ	پنجم سرخوش غریب اللہ اللہ 92

(خوشگو،ص۲۷)

محمد افضل سرخوشؔ کے رباعیات کا دوسرا اہم موضوع عشق ہے اس کا عشق زمینی اور اسمانی بھی نظر آتا ہے۔لیکن کبھی ان کی شاعری میں مجازی کا رنگ ابھر کر آتا ہے۔شاعر اپنے معشوق کی نزاکت بیان کرنے پر جب آتا تو اس کی نزاکت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ پھول کی پتی بھی اس کے پاؤں کے لیے شیشے کی کراچی ہوتی ہے۔کبھی ان کا نظریہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی سماعت پر قلقل مئے کی آواز بھی گران ہے۔مثلاً

گرانست از نزاکت نشہ می درد ماغ او	زبادرنگ صہبا بشکند چون گل ایاغ او
مزاجش تاب شوری نعرہ مستان کجی دارد	کہ برہم می خوردار قلقل مینا دماغ او

رباعیاتِ سرخوش سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شمار ابن عربی ،مولانا رومی جیسے جلیل القدر صوفیاء

سے ہے عمر عزیز کا بڑا حصہ گوشہ نشینی میں گذارا ہے شاہ جمال کے جانشین بھی ہوئے اس کے علاوہ باب رباعیات میں جو شاعر نے تصوف بیان کیا ہے اس سے اخذ ہوتا کہ عشقِ رسول ﷺ پر بہت عقیدت رکھتے تھے۔ سرخوشؔ کو عشق رسول ﷺ کے بارے میں یہ عقیدہ تھا۔

''پاک بود و پاک ماند و پاک رفت'' ۹۳

(سفینہ خوشگو، ص ۷۶)

اسی موضوع پر شاعر کی یہ رباعی سفینہ خوشگو میں موجود ہے۔

سرخوش اگرت نشاہ ہوش وخرد است		رو زود براہی کہ پیمبر بلد است

برذات رسول رہنمائی شدہ ختم		ز انرد کہ رسول ورہنما ہم عدد است ۹۴

(خوشگو، ص ۸۱)

شاعر نے توحید خدا، وحدت الوجود اور وسعت مشرب کو ملا کر اس شعر میں بیان کیا ہے۔

کفر و دین مشفق بوحدت او		سخن ہر دولب یکی باشد ۹۵

(پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ۱۹۶)

اس کے علاوہ سرخوشؔ نے فقر وفنا، بقا و بے خودی، ریاکاری کی مذمت اور عظمت دل وغیرہ کے متصوفانہ مضامین کو اپنے رباعیات میں بیان کیا ہے اس کے علاوہ شاعر نے ہر جگہ خودی اور خبر داری کا درس دیا ہے۔ سرخوشؔ کے مطابق جو انسان خود کو پہچان سکے وہی پروردگار کو پہچان سکتا ہے۔ چند رباعیاں نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

(۱)	ہوشیاری را حجاب یار می دانیم ما		بی خودی را بزم بی اغیار می دانیم ما

تیز می سازد بقتل عاشقاں شمشیر را		ایں قدر ہم رحم از و بسیار می دانیم ما

☆☆☆

(۲)	ز آبادی فزاید شور سودا در داغ من		سودا شہر مشک سودہ افشاند بداغ من

فزاید کاوش غم حسن شور انگیز سودا را		کہ ناخن جلوہ ابرو کند در چشم داغ من

دنیا وے لالچ اور طمع کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے شاعر اس طرح نصیحت کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ زندگی میں ایک اچھا سا رہنما حاصل کرنا چاہے۔ تا کہ انسان اپنے مقصد میں کامیاب

ہو سکے۔آفتاب کو بھی ایک معین راستہ اور وقت ہوتا ہے یعنی اس کی بھی رہنمائی ہوتی ہے۔دو رباعیاں ملاحظہ فرمائے۔

خواہی کہ قدم براہ حق بگذاری — باید کہ بکف دامن پیری آری

بی آئینہ پنبہ در گیرد ہرگز — یک عمر اگر در آفتابش داری

☆☆☆

در اہل جہاں بود قناعت کم تر — مادر زاد است حرص در طبع بشر

بنگو کہ خورد طفل ز یک پشان شیر — در دست بگیرد سر پشان دگر

محمد افضل سرخوشؔ کا عشق وقتی نہیں ہے بلکہ مستقل ہے موت بھی اس کو فنا کرنے کی قوت نہیں رکھتی۔عاشق عاشق محبوب کی تلاش میں کوچہ کی خاک بھی چھانتا ہے عشق کے سبب عاشق کو وہ مقام میسر ہوتا ہے جس کے سامنے دنیا بھر کی بادشاہیت ہیچ ہے۔ہر عاشق اپنے اندر ایک کائینات عشق رکھتا ہے۔جس کا فرمانراوا وہ خود ہے۔لیکن دنیا والے اپنے جہل کی وجہ سے اس کو خاطر میں نہیں لاتے ہے۔جوانکی جہالت اور ضلالت کی دلیل ہے۔

(۱) حسن تو بہر جا کہ شود جلوہ نما — پا انداز است برگ گلہا آنجا

خوباں جہان ز غیرت رخسارت — چوں لالہ بشام داغ بند تر حنا

☆☆☆

(۲) چون برسر نامہ ''ہو'' نویسد دلدار — قاصد در خد متش بگواز من زار

کز رفتم صرف دگر حاجت نیست — ہوی دیوانہ را پسند است ای یار

سرخوشؔ کی رباعیات میں دنیا کی بے ثباتی کافی حد تک نظر آتی ہے۔اس کے نزدیک اگر انسان کتنا بھی مال و دولت دنیا میں جمع کریں اس کا ایک دانہ بھی ساتھ نہیں لینا ہے۔انسان کو چاہے کہ وہ دوسروں کے کام آجائے تا کہ وہ ہمدردی اس کو آخرت میں فائدہ پہنچائے۔کون کتنا بھی قیمتی لباس دنیا میں پہنے لیکن اس آخر جلنا ہی جلنا ہے۔مثلاً

ہر کس کہ بود ز سیم و زر زیب و فرش — باشد پس مرگ ناگزیر از سقرش

بنگر چو شود جامہ زرباف کہن — سوزند در آتش از پی سیم و زرش

ازیں خود کام یاراں رنگ الفت می پردمارا　　　　که آتش می زنند از بہر یک نخچر صحرارا
بہ گلزار کہ بیند ناز عرض لشکر حسنش　　　　تماشا کن شکست فوج فوج رنگ گلسارا ۹٦
(سفینہ خوشگو،۸۰)

محمد افضل سرخوش کے یہاں کچھ خمریہ رباعیات بھی ملتی ہیں۔مگر ان رباعیات کا تعلق دنیاوی شراب سے نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق بادہ عشق الہیٰ سے ہے انھوں نے عشق حقیقی کو بادۂ و ساغر کے پردہ میں پیش کیا ہے اس طرح سے عشقِ حقیقی کا لطف بڑھ گیا ہے۔شاعر کے مطابق دنیا کی بہشت سے صوفی کا خلوت گاہ میں رہنا بہتر ہے۔اتنا وہ تصوف میں گہرا نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر یہ رباعی پیش کرتا ہوں۔تاکہ شاعرِ موصوف کے معیار کا اندازہ ہو جائے۔

(۱)　نیست در عالم بہشتی بہتر از خلوت مرا　　　　دوزخی نبود بشر از گرمی صحبت مرا
دولت بیدار عرفان داد حق نعم البدل　　　　کرد گر گردونِ دون محروم از دولت مرا

☆☆☆

(۲)　از بادۂ مرا فزوں شود عقل و شعور　　　　ساغر مئی یک ذرہ نشاط است وسرور
می روشنی طبع بود سرخوش را　　　　روغن ہمہ در چراغ می گردد نور ۹۷
(کلمات الشعراء،ص۱۰۴)

سرخوش محبوب کے ظاہر حسن کو بیان کرنے کے لیے مختلف رنگ اپناتا ہے۔کبھی رنگا رنگ تشبیہات کو کام میں لاتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ محبوب کا چہرہ اس قدر تابناک ہوتا ہے کہ اس پر نظر نہیں ٹھہرتی ،اب شاعر کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ اس سے مور کے رقص رنگا سے مشابہ کرے یا اس کی رونق کو شیشہ شراب کی تشبیہ سے واضع کرئے۔

سرخوش عجب اینکہ ز اتفاق بیحد　　　　افتادہ موافق بحساب ابجد
تا ز و محبوب و عاشقی و آمت　　　　بے عقل و دراز و رفتنہ و کوتہ قد ۹۸
(خوشگو،ص،۸۱)

شاعر کو معشوق کے بارے میں یہ خیال ہے کہ میرا معشوق بہت رحم دل ہے اس لیے وہ عاشقوں کے قتل کے لیے تلوار کو تیز رکھتا ہے تا کہ وہ زیادہ نہ تڑپیں۔کبھی کہتا ہے اس کی آنکھیں

سب کچھ کہنے کا ملکہ رکھتی ہیں ۔سرخوش نے ہمیشہ رباعیات کے ذریعے اخلاقیات کا درس دیا ہے حرص سے نفرت اور اس کی مذمت دنیا کی بے وقعتی اور علایق دنیا سے گریز و پرہیز کی ترغیب ، بری صحت سے اجتناب ،نفسی ترغیبات سے ہوشیاری اور بے ثباتی دنیا کے مضامین رباعیات میں بدرجہ اتم موجود ہے۔جیسے:

شد کیفت ہمدم و مونس معلوم　　　گردید تمام رنگ مجلس معلوم
بی زر نبود عزت کس در دنیا　　　درخانہ قحبہ قدر مفلس معلوم

☆☆☆

مردم از حسرت بہ پیغامی دلم را شاد کن　　　زیکہ می گفتی فراموشت نسازم یار کن
سرمہ چشمت مگو عاشقاں را نالہ بست　　　ہر قدر می خواہی اکنوں جور کس بیداد کن 99

(سفینہ خوشگو،ص ۹۷)

سرخوش نے اس طرح کے موضوع شعر استعمال کیے جو قاری کو یکدم اپنی طرف کھینچتے ہیں۔اپنی طرف مایل کرنے میں سرخوش کو انفرادیت حاصل ہے ۔یہی اس کی کم گوئی اور آمیزی کا نظریہ ہے۔یعنی عزلت،خلوت خاموشی،جلود و محفل وغیرہ ہے۔شاعر کا کہنا ہے کہ سکوت و خاموشی عشق کا بنیادی جز ہوتا ہے۔جو اس کے خلاف قدم اٹھتا ہے گویا فطرت کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے وہ عشق کا پختہ کار نہیں ہوتا ہے۔اس کے مطابق جو عشق میں جتنا مخلص ہوگا اسی قدر زبان پر خاموشی طاری ہوتی جائے گئی۔عاشق شکوہ تک بھی زبان پر نہیں لاسکتا ہے۔اس کے مطابق عشق اس چیز کو کہتے ہے جس کا سوز از خود معشوق کو متوجہ کرے اور اسے اس قد متاثر کرئے کہ وہ عاشق کا مدعا خود ہی پا یے۔چند اشعار مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائے۔

تاز حرف جستجو یش دم زدم　　　چون دولت کونین زبر ہم زدم
زبس شرم تو ریز در تگ خاموشی بکام　　　چو شمعم گر زبان جنید عرق باشد کلامن

سرخوش کے اسلوب کی بات کرتے ہوئے ہم کو سامنے آتا ہے کہ اپنے عہد کے دیگر شعراء کی طرح اس کے ہاں بھی صنائع لفظی و معنوی کے خوب نمونے ملتے ہیں مراۃ النظیر ،حسن التعلیل ،ایہام لف ونشر معروف صنائع موجود ہے اس کے علاوہ سرخوش کے ہاں مبالغہ کا اندازہ

ضرور ہے۔لیکن خیال آرائی نہیں جو اس کے ہم عصروں کا خاصہ ہے۔

بسکہ میریزد سرشک از دیدۂ گریان ما | پسند از خون چون پر ماہی بہم مژگان ما
حرفی از شیرینی بہائی آن مہ شدر فتم | چون پر ماہی بہم چسپید انگشان ما ۱۰۰؎

(پنجاب کے برگزیدہ غزل گو،ص ۱۹۸)

اس کے علاوہ سرخوشؔ نے مثالیہ کا استعمال کیا ہے۔مثالیہ کے معنی ہے ایک مصرعے میں دعوا پیش کرنا اور دوسرے مصرعے میں اس کو دلیل کی تائید کے لیے مظاہر فطرت یا روزمرہ زندگی سے کوئی مثال لائی جاتی ہے اس کو مثالیہ کا نام دیا جاتا ہے۔اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے۔

خشک زاہد بر نمی آید بحرب شیر جنگ | تیغ چوبین کہ تواند کرد شمشیر جنگ

☆☆☆

ناصر علی سرہندی

عہد اورنگ زیب کی فارسی شاعری کی امتیازی خصوصیت شعراء کی معنی آفرینی کی طرف توجہ تھی اس عہد کے تمام شعراء میں یہ صفت کمال کی موجود تھی مگر ناصرعلی ایک ایسی شخصیت ہے جس نے اس صفت کو نہ صرف اپنے اندر سمویا بلکہ درجہ کمال تک پہنچایا۔ مضمون آفرینی اور تازہ گوئی میں ناصر کا منفرد مقام ہے۔

ساڑھے تین سو سال قبل اس سرزمین پر ناصرعلی سرہندی جیسی عظیم المرتبت شخصیت گذری ہے جو کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ جنہوں نے حسن و جمال اور عشق مجازی کے ساتھ ساتھ تصوف کے مختلف مدارج طے کیئے۔ ناصرعلی سرہندی ایک دوست باش انسان تھے۔ فقر و استغناء، خوش مزاجی و خوش اخلاقی جیسے عناصر ان کی فطرت میں بدرجہ اتم موجود تھے جو انہیں وراثت میں ملے تھے جن شعراء سے ان کے اچھے مراسم تھے ان میں میر محمد زمان خان راسخ، میر محمد راسخ، محمد علی ماہر، موسوی خان فطرت، چندر بھان برہمن کے نام قابل ذکر ہے۔ ان شعراء کے علاوہ ناصرعلی کے معاصرین میں صائب، بیدل، محمد باقی، آفرین، غنیمت کنجاہی اور غنی کاشمیری کا شمار ہوتا ہے۔ ناصرعلی سرہندی کا شمار عہد اورنگ زیب کے ان شعراء میں ہوتا ہے، کہ جنہوں نے ہندوستان کے فارسی ادب کی تابانی اور درخشانی میں اہم رول ادا کیا۔ ان کے نام کے بارے میں تذکرۃ الشعراء میں یوں ذکر ہے۔

> ''ناصرعلی سرہندی عہد اورنگ زیب کے عظیم شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا نام ''ناصرعلی'' تھا اور ''علی'' تخلص کیا کرتے تھے''۔۱۰۱

(تذکرۃ الشعراء، ص۱۹۲)

پنجاب کے مشہور شہر سرہند میں پیدا ہوئے جس کی بنا پر ان کے نام کے ساتھ سرہندی لفظ کا اضافہ ان کی انفرادیت اور ان کے نام کی شناخت بن گی۔ ناصرعلی کی تاریخ پیدائش کے متعلق قطعی فیصلہ ممکن نہیں، البتہ بمطابق مصنفین ''سروآزاد'' اور ''کلمات الشعراء'' ناصرعلی نے ساٹھ برس کی عمر پائی۔ جبکہ ان کی وفات ۲۰ رمضان ۱۱۰۸ھ بمطابق ۱۲ اپریل ۱۶۹۷ء کو

ہوئی۔اس لحاظ سے قرین قیاس یہی ہے کہ وہ ۱۶۳۷ء میں یا اس کے آس پاس پیدا ہوئے ہونگے۔ کچھ تذکرہ نگاروں نے ناصرعلی کو شیخ لکھا ہے اور کچھ انھیں ''میاں'' لکھتے ہے۔البتہ نورالحسن انصاری نے ان کو اپنی کتاب میں اس نام سے قلم بند کیا ہے۔

''وہ سرہند کے ایک معزز سید تھے'' ۱۰۲

(فارسی ادب درعہد آورنگ زیب،ص ۸۰)

اردو کے شاعر ولی دکنی بھی ناصرعلی کے ہمعصر تھے۔صائب کی قدردانی کے باوجود شاعرانہ طور پر ناصرعلی ان کی عظمت کو قبول نہ کرسکے۔ جہاں تک مرزا عبدالقادر بیدلؔ اور ولی دکنی سے تعلق کا سوال ہے ان سے وقتاً فوقتاً نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ایک مرتبہ بیدلؔ نے ناصرعلی کو اپنی مثنوی ''طور معرفت'' کا یہ شعر سنایا۔

''مزن بر ہیچ سنگی ہیچ دستی

کہ مینا در بغل خفتہ است مستی'' ۱۰۳

(دیوان ناصرعلی، مخطوطہ نمبر ۸۸/۸۸)

ناصرعلی نے صرف دوسرے مصرعے کی تعریف کی۔ یہ بات بیدلؔ کو اچھی نہ لگی تو اس نے طنزاً کہا کہ پہلا مصرعہ آپ لگا دیجے تو ناصرعلی نے جواب دیا کہ یہ ان کے معیار سے فروتر ہے۔

محمد افضل سرخوشؔ ناصرعلی کے ہمعصر، ہم صحبت اور ہم مشق تھے سرخوشؔ ان کی تعریف کرتے ہوئے انہیں '' آبروے ہندوستان'' لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ صد افسوس کہ ناصرعلی بےفیض زمانہ میں پیدا ہوئے جس کی وجہ سے انہیں حسب لیاقت عزت نہ ملی۔سرخوشؔ لکھتا ہے کہ ہم دونوں بچپن سے ساتھ پڑھے لکھے اور ساتھ ہی مشق سخن کی۔ناصرعلی کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے محمد افضل سرخوشؔ اس طرح رقمطراز ہیں۔

'' آبروی ہندوستان میاں ناصرعلی از اہل ہند سخنور بلند خیال، معنی یاب، ذوالہمت والکمال ہم چو او برنخاستہ۔۔۔۔در ایران صائب است و در ہند ناصرعلی است،سوائے شعر حسن خلق و دلگرامی و خدا شناسی و ہمت وسخاوت

واستغناء بے پروائی مرتبہ وارد کہ در ہیچ مخلوق دیدہ نمی شود۔'' ۱۰۴

(چکیدہ تاریخ ادبیات ایران،ص ۱۲۵)

ناصر علی سرہندی کو اہل علم ہندوستانی ہونے کے باعث ناصر علی لکھتے ہیں۔ یہ نازک خیالی اور معنی یابی میں بے عدیل تھے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کبھی کبھی فکر میں غرق ہونے کے وجہ سے جنون میں مبتلا ہوتے۔اور معنی کے تلاش میں بے معنی ہوگئے ہیں۔یعنی عرفان ومعرفت کے دائرے سے باہر نکلے۔ڈاکٹر منظر امام نے اپنی کتاب چکیدہ تاریخ ادبیات ایران جلد دوم میں لکھا ہے کہ شروع شروع میں ناصر علی نہایت متقی اور پرہیز گار تھے۔ بعد ان کے سمجھ میں کیا آیا کہ شریعت کے دائرے سے نکل کر بے قید اور مجذوبی کے راستے سے بٹک گئے۔بعض لوگوں کا قول ہے کہ ان کہ اس بے راہ روی کو دیکھ کر عالمگیر نے انہیں دربار میں طلب کیا،انہیں وہم ہوا کہ خدا جانے کیوں بلایا ہے۔سرخوش کے مطابق کچھ لوگوں نے یہ الزام عاید کیا ہے یہ لوگ استادوں کی غزلوں کو اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ناصر علی نے یہ سن کر کہا کہ آو اگر کوئی امتحان کرنا چاہتا ہے،تو وہ کرسکتا۔ اپنے کمال کو واضح کیا تھا۔اُس وقت انھوں نے اس دوبیتی ''آب استادہ است آفتاب استادہ است'' کے برعکس یہ حسن مطلع لکھا۔

اہل ہمت را نباشد تکیہ بر بازوی کس

خیمۂ افلاک چوب وطناب استادہ است ۱۰۵

(دیوان ناصر علی،مخطوطہ نیشنل میوزیم دہلی)

ناصر علی کو ایران جانے کی بہت خواہش تھی لیکن انھوں نے بھی حافظ شیرازی کی پیروی میں وطن سے باہر جانے کی خواہش کو وطن سے بے پناہ محبت کی وجہ سے ترک کردیا تھا۔ناصر علی نے اس طرح کہا ہے۔

علی امسال موقوف است سیر گلشن ایران

چو داغ لالہ دامن گیر دل شد خاک پنجابم ۱۰۶

(بزم تیمورہ جلد سوم،ص،۱۷)

ناصر علی سرہندی نے اپنی شاعری میں رباعیات کی طرف خاص توجہ مبذول کی تھی۔انہوں نے رباعیوں کی طرف توجہ فرمائی،چنانچہ ان کے یہاں نعت ومنقبت کی کافی

رباعیاں ملتی ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے کچھ رباعیاں مغفرت کی بھی کہی ہیں۔ان تمام رباعیوں میں خلوص اورصداقت کی جھلک صاف طور پر نمایاں ہے۔چندرباعیاں نمونہ کے طور پر پیش کرتا ہوں۔حضرت ابوبکرصدیقؓ کی شان میں ان کی یہ رباعی اس طرح ہے۔

آن بادہ کہ درمیکدہ تحقیق است ازابن ابی قحافہ اش ابریق است
آغاز وجود ازگہرپاک نبی است تصدیق نخستین زدل صدیق است ۱۰۷؎

(تصحیح دیوان،ص،۵۶)

ناصرعلی نے حضرت عمرفاروقؓ کی مدح میں یہ رباعی پیش کی ہیں۔

ہرنخل کہ درقلم وخیروشراست زفیض عدالت است اگربازوراست
این کاہ کشان کہ دیدہ باشی ہرشب بردوش فلک درہ عدل عمراست ۱۰۸؎

(تصحیح دیوان، ناصر،ص،۵۷)

اسی طرح ناصرعلی سرہندی نے حضرت عثمانؓ کی شان میں یہ رباعی کہی:

آن نورحیا کہ نام اوعثمان بود درباغ شہادتش گل ایمان بود
ہرقطرہ خون کہ ریخت ازپیکراو عنوان آرائی آیۃ قرآن بود

اس کے علاوہ حضرت علیؓ کی شان میں یہ رباعی کہی:

ای منکرانفکاک رایت بہ خطاست اینجااست کہ ہرچہ می سرائی بیجااست
فرمود نبیﷺ لحمک لحمی بہ علی شق قمر از وجودایشان پیداست ۱۰۹؎

(تصحیح دیوان،ص،۵۷)

ناصرعلی سرہندی کی رباعیات میں عشق ومحبت کی بھی گرمی پائی جاتی ہے،انھوں نے اپنی رباعیوں میں عشق کے مختلف پہلوؤں کوواضح کیا ہے۔انھوں نے ہجر کے مصائب بیان کئے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ وصل معشوق نہایت مشکل امر ہے۔بعض رباعیات میں محبوب کے عشوہ غمزہ کی عکاسی کی ہے کچھ رباعیات ایسی ہیں جن میں انھوں نے پورانہ سے خطاب کیا ہے،ناصرعلی کے رباعیات کو جائزہ لیتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی رباعیاں دردوسوز میں سراپا ڈوبی ہوئی ہیں۔

(۱) وحشتم از دل ہر ذرہ نمایاں کردند آنقدر نبودم کہ پریشان کردند
جادۂ راہ محبت کہ دم شمشیر است نفس سوختہ بود کہ پنہان کردند

☆☆☆

(۲) برق تازان فنا تا کمر دل بستند چون شرر بر نفس سوختہ محمل بستند
تو بہ ہار انفس بار پسین دست رواست بی خیز دہر رسیدی در منزل بستند ۱۱۰

(کلمات الشعراء، ص ۷٦)

ناصر علی کی رباعیات میں زیادہ ٹھہراو، زیادہ متانت اور زیادہ گہرائی و گیرائی نظر آتی ہے۔ بیشتر رباعیاں وارداتِ قلبی کی مظہر معلوم ہوتی ہیں۔ بہرحال ناصر علی کی شاعری سے ظاہر ہوا ہے کہ جو فارسی کا بڑا صاحبِ فن ہوگا اسکی رباعیات بھی بلند پایہ ہوں گئی۔ اس لحاظ سے شاعر کا نام فارسی کے اعظیم رباعی گو شعراء میں گنا جاتا ہے۔

بجز من کسوت دیگر نپوشد آفتاب من زور و خویش دار و شیشہ چون اخگر شراب من
یکی شد ہمچو درد وصاف می روز و شب عالم آبس لرزید چرخ شیشہ رنگ از اضطراب من ۱۱۱

(کلمات الشعر، ص، ۷٦)

ناصر علی نے ذاتی رباعیاں بھی کئی ہیں۔ یہاں اس قسم کے رباعیوں میں بہت سے سانحہ کی طرف اشعارہ کیا ہے۔ جہانگیر کی تعریف بھی ناصر نے رباعی کے ذریعے کی۔

در ملک سخن بود جہانگیر علی در مشرب دل ولی علی پیر علی
با شعر علی نمی رسد شعر کسی زانسان کہ خط کسی بخط میر علی ۱۱۲

(کلمات الشعر، ص ۷۵)

ناصر علی اپنے دور کے مایہ ناز شاعر تھے۔ ان کی شہرت کا اعتراف اُنکے معاصرین نے بھی کیا ہے۔ مقبولیت کا راز یہ ہے کہ بعض شعراء نے اُنکی پیروی بھی کی ہے اور اُنکے انداز میں کلام کہنے کی کوشش کی ہے احمد عبرتؔ جیسے شعراء نے اگر رقابت کی بنا پر ناصر علی کے رنگ میں غزل کہنے کی جسارت کی، تاہم اس سے ناصر علی کی مقبولیت اور عظمت پر حرف نہیں آتا بلکہ اس

سے ناصر علی کی استادی کا فن ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ جن بزرگان دین اور صوفیاء اکرام سے ناصر علی کے تعلقات اچھے تھے یا جن لوگوں نے انھیں متاثر کیا ان میں شاہ حمید الدین، شاہ عادل، افضل نبی شاہ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، نصیرالدین چراغ دہلوی کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ان سب بزرگوں کے وہ نہایت قدردان اور عقیدت مند تھے۔عشق رسول ﷺ کا تو یہ حال تھا کہ وہ اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں:۔

پیش از ہمہ شاہان غیور آمدہ   ہر چند کہ بظہور آمدہ
اے ختم رسل قرب تو معلومم شد   دیر آمدہ زراہ دور آمدہ ۱۱۳

(سفینہ خوشگو، ص،۱۶)

ناصر علی کے ہمعصر حفیظ اللہ خان یہ نعتیہ رباعی سن کر عش عش کر اُٹھے۔انھوں نے اپنے تمنا کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:۔

''ای کاش این رباعی نصیب من می شد کہ وسیلۂ نجات می گردید۔''

یہ خراج عقیدت پیش کر کے ان کی پیروی کی۔اور مندرجہ ذیل رباعی لکھ کر اپنی عقیدت مندی کا ثبوت دیا۔

درانجمن دہر نخست آمدہ   زانگونہ کہ شایستہ تست آمدہ
اے ختم رسل اگرچہ در بزم وجود   دیر آمدۂ ولی درست آمدہ ۱۱۴

(دیوان ناصر علی، مخطوطہ ۸۸)

اس حقیقت کو نظر انداز کرنا مشکل ہے کہ کلامِ ناصر علی کو ہمیشہ تعریف وتوصیف ہی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا، بلکہ بعض ناقدین نے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ انکے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے بعض ناقدین نے ان کے اسلوب کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس ضمن میں جہاں معاصرین نے اپنے فرائض انجام دیئے ہیں وہیں ناصر علی کے احباب وطرفداروں کی جانب سے دفاع بھی ہوتا ہے۔اُن کے اسلوب پر جن ناقدین نے اپنی آراء پیش کی ہیں ان پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں:

''ناصر علی سرہندی فارسی کے بدنام شاعر ہیں اوراس جرم کی
(جسے سبک ہندی کہا جاتا ہے) اسی ہندی کو ناصر کے سر تھوپی
جارہی ہے۔یعنی خیال آفرینی کی پوری سزا اسی کو ہی مل رہی
ہے۔ چنانچہ اگلے پچھلے سبھی ناصر علی پر برس رہے ہیں خان
آرزو ہندوستان کے فارسی شاعروں کے بارے میں کچھ
زیادہ پر جوش نہیں رہے۔غالب ہندی نژاد تو انھوں نے
ناصر علی کا نام ہر جگہ تضحیک سے لیا ہے اور انھیں قتیل اور
لالہ ٹیک چندر بہار وغیرہ کی صف میں کھڑا کیا ہے:۔'' ۱۵

(فارسی ادب وزبان،ص۱۲۳)

ناصر علی نے تمثیل اور استدلال پر زیادہ توجہ دی ہے وہ اپنے خیالات کی ترسیل وابلاغ کے لئے خوبصورت تشبیہات واستعارات کی تخلیق کرتے ہیں۔جس باعث ایجاز واختصار ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔غزل کے علاوہ مرثیہ،مثنوی،قصیدہ، رباعی وغیرہ اصناف ادب میں ناصر علی نے درجہ کمال حاصل کیا ہے۔دیکھا گیا ہے کہ پنجاب کے اکثر شعراء نے عموماً مجاز ہی کے در سے ہوکر عشق حقیقی کی جانب گزرجاتے ہیں۔ناصر علی پنجاب کے صوفی شاعر تھے لہذا اس شعری رجحان سے ان کا متاثر ہونا فطری تھا۔وہ کہتے تھے:۔

نیک و بد درچشم عارف نغمہ یک پردہ اند
عکس معشوقیم ای آئینہ در واکرد نیست ۱۶

(پنجاب میں برگزیدہ غزل گو، ص۱۳۳)

ناصر علی سرہندی کی شاعری کا کمال اور وسعت خیال کی بلندی کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک ہی مثال کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہوئے اسے مختلف معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔معنی میں تضاد کے باوجود منطقی استدلال سے شاعر کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے۔شاعر نے عزت نفس اور خودداری کو اس شعر میں موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

حباب می شکند کاسہ بر سر دریا

طمع ز مردم با آبرو نمی آید

ناصرعلی کے خیال میں عشق ایک جذبہ ہے، ذوق ہے، یقین ہے، یہ ایک جوش اور ولولہ ہے، جو عقل اور خرد کی غلامی قبول نہیں کرتا۔ عقل محدود ہے اور عشق لامحدود ہے ناصرعلی کے نزدیک عشق ایک دریا ہے اور عقل وخرد کی حیثیت ایک کشتی سے زیادہ نہیں۔ ایک سچا عاشق ذرے ذرے میں خدا کے جلووں کا نظارہ کرتا ہے خدا کائینات کے ہر رنگ میں بکھرا ہوا ہے۔ اسکے جلوے ہر سو ہیں بشرطیکہ دیکھنے والی نظر ہو۔ یہ نظر اُسوقت پیدا ہوتی ہے جب خدا سے سچا عشق ہو۔ یہی ملل چیزیں وہ ہے جو ناصرعلی کے کلام کو اونچے درجے تک پہچاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائے:۔

''بزورِ عقل نتوان شد حریفِ عشق بی پروا
عنان در قبضئہ دریا بود کشتی سواران را
عشق از جلوہ گہہ ناز تو مایوس نبود
ورنہ شہبال خرد جز لب ِافسوس نبود'' ۱۱۷

(دیوان ناصرعلی، مخطوطہ ۱۱۴۴ھ)

ناصرعلی کی رندی وسرمستی اور سخاوت کا یہ حال تھا کہ جو رقم انھیں انعام میں ملتی، سب غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتا تھا خوش گو لکھتے ہیں کہ وہ خلعت پہن کر ہاتھی پر سوار ہو گئے اور مٹھیاں بھر بھر کر روپے بکھیرتے چلے گئے۔ دوسرے دن پیدل خلعت پہن کر شراب خانہ تک پہنچے اور شراب کے چند جام کے بدلے وہی خلعت مے فروش کے حوالے کر دی۔ دراصل ناصر علی قلندرانہ صفات کے مالک تھے۔ بے با کی اور خود داری ان کے مزاج میں بکثرت موجود تھی۔ ۱۶۸۹ء کا واقعہ ہے کہ اورنگ زیب کی فوجیں بیجاپور میں خیمہ زن تھیں جنگی فتوحات کی غایت سے اورنگ زیب بھی وہاں موجود تھے ناصرعلی کو ان سے ملاقات کا موقع ملا تو بوقت ملاقات ناصرعلی نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو بادشاہ کو ان کی یہ حرکت ناگوار گذری اور انھیں بھی بادشاہ کا یہ رویہ پسند نہ آیا۔ اس واقعہ کو'' تذکرہ شعرائے پنجاب'' میں یوں بیان کیا گیا ہے:۔

''درسال ہزار و یک صد و یک بہ لشکر عالمگیری رفت۔ وقت
ملازمت پادشاہ دست بہ مصافحہ دراز کرد۔ پادشاہ بے دماغ
شدہ فرمودہ فقط شاعر است، آداب نمی داند۔ وی بے دماغ
تر شدہ برگردید'' [۱۱۸]

(تذکرہ شعرائے پنجاب، ص۔۲۵۰)

اورنگ زیب کو جب وزیروں کی زبانی ناصر علی کی شاعرانہ خصوصیات کا علم ہوا تو انھوں نے دو روپیہ مہینہ جاری کرتے ہوئے فرمایا:۔

''اگر زبان را بہ انشائے شعر آشنا نکند، دو روپیہ یومیہ بر ہر مکانی
کہ التماس نماید مقررہ کردہ شوف'' [۱۱۹]

(تذکرہ شعرائے پنجاب، ص۔۲۵۰)

اس سب کے باوجود ناصر علی کے دل میں اورنگ زیب کے لیئے عزت واحترام کم نہ تھا اور ان کی شایان شان اپنی مثنوی میں یوں مدح سرائی کی ہے:

محی الدین محمد اورنگ زیب
فضائے شش جہت بر شوخیش تنگ

المختصر ناصر علی بنیادی طور پر صوفی شاعر ہیں ان کی شاعری میں عشقیہ اشعار بکثرت ملتے ہیں بہت سے اشعار کا اطلاق عشق حقیقی پر مبنی ہے لیکن ایسے اشعار بھی کم نہیں جن میں عشق حقیقی ومجازی دونوں ہی کا گمان ہوتا ہے۔ ایسے اشعار کم ہیں جن میں محض عشق مجازی بیان کیا ہے عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی وہ اس کے لیے ایک ایسے دل کی دعا کرتے ہیں جس میں جوش، جذبہ اور ولولہ ہو۔ ناصر علی کے تین بیٹے تھے۔ ایک کا نام علی عظیم، دوسرے کا نام علی علیم، تیسرے کا نام علی کریم تھا، اور تینوں شعر وشاعری کا شوق وذوق رکھتے تھے۔ ان میں علی عظیم اچھا شاعر تھا۔ چند اشعار سے ان کا علمی معیار معلوم ہوگا۔

دارم ویرانہ برون از شہر وحشت گوشہ دارم چو مژگان درسواد چشم آہو خانہ
از بیابان عدم تا سر بازار وجود بہ تلاش کفنی آمدہ عریانی چند [۱۲۰]

(سفینہ خوشگو،ص،۲۷۳)

ناصر علی سرہندی وفات کے وقت اپنے بڑے بیٹے کو بلایا اور اس کے سامنے یہ حساس بھری آواز میں یہ شعر کہا تھا۔

عظیم الدین محمد صاحب ہوش

من وتو ہر دو یک خواب فراموش[۱۲۱]

(خزانہ عامرہ،ص،۳۳۰)

ناصر علی سرہندی نے اپنی شاعری کے ذریعے سماج میں بدعتوں اور جدت پسندیوں کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی ہے۔ان کی شاعری میں بہ کثرت جدید اور نئے تجربے نظر آتے ہیں۔بات سے بات پیدا کرنا اور سوچ وفکر کو نئی جہت عطا کرنا ناصر علی کا خاصہ کام ہے۔ناصر علی نے شاعری کے ذریعے سات آسمانوں کی سیر کی ہیں۔شاعری کے میدان میں شہباز کی طرح پرواز کی ہے۔ان کے کلام میں چاشنی و لذت موجود ہے۔مثلاً

صبح پیری ھا دمید از آسمان زندگی　　شد عیان از چہرہ گرد کاروان زندگی

قامت خم گشتہ ام چون سایہ یکسان شد بہ خاک　　بر زمین افتاد آخر آسمان زندگی

اس کے علاوہ ناصر علی سرہندی کے کلام میں مضمون آفرینی بہ کثرت نظر آتے ہیں۔اس ضمن میں ان کی ایک ذاتی رباعی پیش کرتا ہوں۔

آمد خبر تپ تو در گلشن دوش　　بیمار فتاد سرو و گل رفت ز ہوش

تا حرف تپ تو نشنود بار دگر　　از شبنم صبح گل نہد پنبہ بگوش[۱۲۲]

(نسخہ خطی دیوان،ص،۱۱۱)

عشق رسول ﷺ کے ساتھ ناصر علی سرہندی کو خاص وابستگی تھی ایک رباعی کے ذریعے اس طرح شان رسول ﷺ کو بیان کیا ہے:۔

تا چند ز دوری تو آزار کشم　　در وصل ہم انتظار دیدار کشم

نیرنگ جمال او جہانی دارد　　تصویر کدام صورت یار کشم

ناصرعلی سرہندی کی رباعی رقص زنی کے بارے میں درجہ ذیل پیش کرتا ہوں۔

مرداں بہ کف خویش نگیرند درم را　　　　دائم مرض رعشہ بود دست کرم را

درویشی وشہرت چہ بلاغیب تمام است　　　　لیکن نتواں کرد نہای نقش قدم را ۱۲۳؎

(سفینہ خوشگو،ص،۲)

سفینہ خوشگو میں ناصرعلی سرہندی کی تاریخ وفات ۱۱۸۰ھ موجود ہے بندرداس خوشگو نے ان کی آخری زندگی کے بارے میں یوں درج کیا ہے۔

''آخر عمر بادشاہ مخزوبی بدعویٰ مطبیت درشاہ جہاں آباد فرو کش کرد۔ و دم از دوستی حضرت بوعلی قلندر می زد۔ بتاریخ بستیم رمضان سال ہزاروصد ہشت سیر عالم بالا نمود و درراہ روضہ حضرت نظام الدین اولیاء مدفون گردید'' ۱۲۴؎

(خوشگو،۳)

اس کے علاوہ سرخوش نے یہ قطعہ ناصرعلی سرہندی کی تاریخ وفات پر قلم بند کیا۔

واستہ علی بہ ہمت بے پروا　　　　ازراحت ورنج دہر مستغنی رفت

دائم چوتوجہش سوی معنی بود　　　　دل کندوزصورتکدہ ہستی رفت

سرخوش زخرد سال وفاتش پرسید　　　　گفت آہ علی بعالم معنی رفت

ناصرعلی نے عاشق کے اضطراب کو رباعی میں یوں بیان کیا ہے۔

برزبان نامش شاید منت احسانی را　　　　پردہ شرم مکش شاید پنہانی را

دیدہ ازکلفت اشکم شدہ درخاک نہاں　　　　سہل آوردہ درین بحر بیابانی را

ناصرعلی حلقہ صوفیت میں واپس آنے بعد نقشبندیہ سلسلہ سے جڑ گئے۔اسی دوران تائیب ہونے کے بعد ناصرعلی نے قطب کے مقام کا دعواے بھی کیا۔اس باطنی تغیر وتبدل اور انقلاب کے ضمن میں وہ فرماتے ہیں۔

مستی ازخلوت تجرید بدر کردامرا　　　　آمدورفت نفس زیروزبر کردمرا

یاردرخلوت دل انچمنے ساختہ بود　　　　بےخودی آمد ویکبارخبر کردمرا ۱۲۵؎

(دیوان ناصر علی، ص ۱۷)

دوسری جگہ عشق رسول ؐ کا یوں اظہار کیا ہے۔

آنم کہ زفقرِ احمدی آ گاہم　　　　در انجمن قبول صاحب جاہم

معشوق قلندرم جہان ملک من است　　یعنی کہ خلیفہ رسول اللہ ام

☆☆☆

واقف بٹالوی کا اصلی نام تایب بیگ ،عرفِ نام بیکتا تھا،نورالعین کولقب کے طور پر استعمال کرتے تھے۔واقف تخلّص استعمال کرتے ۔واقفؔ کے والدمحترم امانت اللہ قصبہ بٹالہ کے قاضی تھے۔جو اس عہد میں صوبہ لاہور کا ایک پرگنہ تھا۔یہ قصبہ لاہور سے تیس کوس شرقاً پرواقعہ ہےاور آج پنجاب کے ضلع گرداسپور کے نام سے جانا جاتا ہے۔واقفؔ بٹالوی کے پدرِمحترم عہد محمد شاہی میں ''امانت خان'' اور'' ملک القضاۃ'' کے خطاب سے مشہور تھے۔اس شہرت اور نیک نامی کے بدولت واقفؔ کی زندگی پر گہرا اثر پڑھ گیا۔واقفؔ کے خاندان میں علم وفضل کا چراغ پہلے سے ہی روشن تھا۔اس سے عیاں ہوتا ہے کہ واقفؔ بٹالوی کی پرورش علمی خاندان میں ہوئی۔مصنف''سفینۂ خوشگو'' نے شاعر کی پرورش کے بارے میں یوں قلم بند کیا ہے۔

''پسر سیوم قاضی امانت اللہ کہ او آباواجداد تا عہد محمد شاہی بقضای پرگنہ بٹالہ تابع صوبہ لاہور کہ وطن مشارالیہ است۔بہ نیکنامی وخدا پرستی شخصیت امور میفر مائد وآں قاضی زادہ سخن شناس با کثرت فضائل وکمالات مخصوص است وخیلی خلیق ومتواضع وآشنا پرست واقع شدہ۔فقیر وقتیکہ بعد سیر ولادیت کانکرہ از کوہ فرود آمدم تنا بشوق ملاقاتش کہ اشعار وی درالخلافہ رسیدہ بود''۱۲۶

(سفینۂ خوشگو،ص)

اکثر تذکروں اور کتابوں میں موصوف کونورالعین نام سے لکھا گیا۔اور تخلّص واقفؔ ہی منقول ہے۔آزاد بلگرامی نے بھی شاعر موصوف کواسی نام سے رقم طراز کیا ہے۔

''شیخ نورالعین نام دارد خلف قاضی امانت اللہ ساکن بتالہ بفتح باموجدہ وتا فوقانے ہندی بروزن قصبہ حلالہ این است از توابع دارالسلطنۃ لاہور بفاصلہ سی کردہ جانب شرق منصب قضاءآن مکان بہ سلسلہ آباءاو تعلق دارد وصاحب افکار صائبہ وزبدہ شعراءفناجیہ است''۱۲۷

(خزانہ عامرہ،ص،۴۵۰)

اس کے علاوہ تیمور شاہ درانی نے کہا کہ یہ ان کا پیدائشی نام نہ تھا آزاد بلگرامی نے بیان کو اس طرح لکھا ہے۔

''شماسہ نام و یک تخلص و دو لقب دارد، با مشرف فقیر این چہ اسراف است''۱۲۸

(خزانہ عامرہ، ص ۴۵۲)

واقفؔ کی ولادت ۱۱۰۰ھ بہ مطابق ۱۶۸۹ء بٹالہ میں ہوئی تھی۔ علمی خاندان کی وجہ سے واقفؔ کا شروع سے ہی اچھے لوگوں سے اٹھنا بیٹھنا رہا تھا۔ ذہنی طور پر بھی واقفؔ بہت ہوشیار تھے۔ جس کی بدولت سے واقفؔ کو ادب شناس و علم پروروں سے شغف ہونا شروع ہو گیا۔ واقفؔ نے زمانے کے رسم و رواج کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ شیخ محمد سعید کے ساتھ شاعر موصوف کو بہت وابستگی تھی۔ شیخ محمد سعید نے واقفؔ کو نور العین کا خطاب عطا کیا۔ تذکرہ شعرائے پنجاب کے مطابق واقفؔ نے دیگر علم و فنون میں میر محمد معصوم سے کسب فیض حاصل کیا۔ مثلاً مندرجہ ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ واقفؔ علم و ادب کے کتنے شوقی تھے۔

''واقفؔ الحق مرد عزیز است، مشق سخن از نظیر میر محمد معصوم وجدان گذارنید
واکثر شعرای پنجاب صحبتہا داشتہ''۱۲۹

(تذکرہ شعرائے پنجاب، ص ۳۸۲)

شاعر کو استاد اعلیٰ حاکم حکیم عبداللہ نے نور العین کے بجائے واقف تخلص رکھنے کو کہا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق نور العین مقطعے میں درست نہیں آتا۔ پھر اسی بنا پر شاعر نے اپنا تخلص تبدیل کر کے استاد کے مشورے کو اپنا کر 'واقفؔ' رکھا تھا۔ عہد کے رسم کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے شعر و ادب کی طرف گامزن ہوئے۔ علی محمد تجرد کی مدد سے خان آرزو سے اپنا کلام دیکھانے لگے اور خان آرزو کے قلمی شاگرد بنے۔ حتیٰ کہ ڈاک کے ذریعے بھی ان سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کے علاوہ بندرابن داس خوشگو اور شاہ فقیر اللہ آفرین سے بھی اصلاح لی۔ واقفؔ بٹالوی نے حاکم لاہوری کے ساتھ بہت سیر و سفر کئیں تھے۔ ان کے ساتھ حج کے لیے بھی تشریف لے گئے لیکن صحت ناساز گار ہونے کی وجہ سے راستے میں ہی روکنا پڑا۔ انھوں نے پانچ ماہ اورنگ آباد میں گزارے ہیں۔ ایک دن آورنگ آباد اور بالا پور کے درمیان ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تھا اور ایک عینک کے سوائے کچھ بھی ان کے پاس نہیں رہا۔ بعد ازاں انہوں نے

آزاد بلگرامی کے پاس مدد کے لئے ایک قاصد بجھا تھا۔واقفؔ بٹالوی نے آزاد بلگرامی کو رباعی کے ذریعے اپنا حال پیش کیا۔ جو نیچے پیش کرتا ہوں۔

کردند غریب غارتی راہزنان　　　سر ماندونماند ہیچ چیز از سامان

بردند ہر آنچہ بود الا عینک　　　دامانده بماہمین دوچشم حیران۔ ۱۳۰؎

(خزانہ عامرہ،ص،۴۵۱)

مذکورہ رباعی کے علاوہ شاعر نے ایک اور شعر بھی اس وقت بیان کیا ہے۔

عینکی و پارہ سیماب باماندہ است　　　چشم بیخواب ودل بیتاب ماباماندہ است۔۱۳۱؎

(ایضاً،ص ۴۵۱)

یہ حالت سنتے ہی آزادؔ بلگرامی نے کچھ رقم بذیعہ ڈاک بھجوادیا۔اس کے بعد ہی واقفؔ بالا پور میں بیمار ہوگے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کولوگ کندھوں پر اٹھاتے تھے۔اس بنا پر آزاد نے دوبارہ واقفؔ بٹالوی کے لیے پیسے بھیج دیے۔بعد میں واقفؔ کو اپنے وطن بٹالہ روانہ کیا گیا۔بہر حال اس سفر کے بعد واقفؔ کی معاشی حالت بگڑ گئی اور عمر بزرگی میں بھی تلاش معاش کے لیے بہت دوڑ و دھوپ کرنی پڑی۔واقفؔ کچھ وقت پاک پٹن میں بھی رہے لیکن وہاں ان کو ناکامیابی کا سامنا کرنا پڑا۔اس کے بعد کشمیر میں احمد شاہ درانی کے ناظم ''بلند خان'' کی خدمت بھی کی لیکن وہاں بھی واقفؔ بہت بیمار ہوگئے تھے۔علاوہ ازاین ڈیرہ غازی خان کے دربار میں ناظم کی حیثیت سے کام کیا۔اسی عہد میں واقفؔ کے پیارے دوست کا انتقال ہوگیا۔بلند خان کے پاس پانچ ماہ بڑی خوشحالی کے ساتھ گزارے تھے۔حاکم سے جو بھی پیسہ کمایا اس کا بیشتر حصہ صحت کی ناسازگاری کے لیے استعمال کیا۔وہاں آکر وطن میں ایک سال گزارنے کے بعد ملتان چلا گیا اور گوشہ نشینی اختیار کی۔تاریخ کے مطابق یہ واقعہ ۱۱۸۱ھ کا ہے۔بہر حال احمد شاہ درانی کے امراء اور وزیروں نے واقفؔ کو وقت وقت پر مالی مدد کی۔یہ عہد واقفؔ کی حیات میں کافی اہمیت کا حامل تھا۔۱۷۷۵ء میں احمد شاہ درانی نے تیمور شاہ درانی کو ہندوستان کے کچھ علاقوں کا حاکم بنا کر بیجھا۔تو حاکم نے واقفؔ کو دربار میں آنے کی دعوت دی اس وقت بھی واقفؔ کی حالت ٹھیک نہیں تھی لیکن مجبوراً جانا پڑا۔بادشاہ نے واقفؔ کی بہت تعظیم رکھی تھی۔یہاں واقفؔ نے حاکم تیمور شاہ کی مدح میں قصائد پیش کیئے۔اور وقتاً فوقتاً انعام واکرام اور لطف وغایت سے سرافراز ہوتا رہا۔اس دربار

کے ساتھ سات آٹھ ماہ ملک رہا۔اس کے بعد جب تیمور شاہ نے سرکشوں کے قتل عام کا حاکم دیا اس قتل عام کو رکوانے کے لئے دربار کے علماء شعراء وامرا نے عریضہ بھجوانا شروع کئے واقفؔ نے شعر کے ذریعے اپنی عرضی کو پیش کی۔

ندیدہ ہیچ کس ظل پیمبر بحمد اللہ کہ ظل اللہ دیدم۔۱۳۲

(پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ص ۲۷۲)

بہرحال ۱۷۶۰ء کو واقفؔ حج روانہ ہونے تک لاہور میں ہی مقیم رہے۔انیس العاشقین کے مطابق واقفؔ کا انتقال ۱۲۰۳ء میں ہوا۔''نتائج افکار'' اور''روزِ روشن'' میں ان کی سنہ وفات ۱۱۹۵ھ درج ہے۔

تصنیفاتِ واقفؔ بٹالوی:۔واقفؔ کو شعری تخلیقات کی تعداد مقرر نہیں ہے۔مختلف تذکرہ نگاروں نے مختلف انداز میں اپنی رائے کو قائم کیا۔البتہ اس بات پر سبھی متفق ہے کہ انہوں نے کثرالتعداد میں اشعار قلم بند کئے ہیں۔کچھ تذکرہ نگاروں کے مطابق ان کے دیوان میں سات ہزار اشعار ہیں۔اس کے بعد بہت وقت تک حیات تھے اور شعروادب ہی کے ساتھ وابسطہ رہے تھے۔بہت مدت تک مسلسل طور پر شعروادب کے ساتھ وابستہ رہے۔کرنل خواجہ عبدالرشید واقفؔ کے دیوان کے بارئے میں یوں رقم طراز ہے۔

''دیوانی قریب شش ہفت بیت ترتیب دادہ ،قصائد ہم دارد ،ترجیع بندی درکمال فصاحت و بدر دگفتہ، عاشق غزل است و رباعی ہم خوب می گوید''۱۳۳

(تذکرہ شعرائے پنجاب،ص ۳۸۲)

پروفیسر غلام ربانی نے حال ہی میں دیوان میں تصیح وترتیب کر کے ۱۹۶۲ء میں نول کشور سے شائع کرایا ان کے مطابق دیوان میں ۱۵ ہزار اشعار موجود ہے۔۷۴۴ صفحات پر مشتمل ہے ۲۰۵ رباعیات ودس صفحات کا ایک ترجیع بند،مخمس وغیرہ ہے۔

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر موصوف نے بہت سے اصناف ادب پر طبع آزمائی کی تھی۔خاص کر رباعیات کے ساتھ ان کو پہلے سے ہی رحجان تھا۔اکثر دیکھنے کو ملتا ہے کہ شاعر عمر کی آخری عرصہ میں رباعیات پر قلم زنی کرتے ہیں لیکن واقفؔ بٹالوی نے پہلے سے ہی اس لچک دار صنف پر قلم اٹھا

یا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے کلام میں شرینی، پختگی، استادی کمال کی موجود تھی۔ مثلاً

''میگویدناخن بدل میزند و خالی از تلاش ولطف نیست، پختگی و استادی از بخش معلوم است'' ۱۳۴

(تذکرہ شعراء پنجاب، ص،۳۸۲)

خود واقفؔ نے اپنے بارے میں فرمایا۔

نالہ ای چند کردہ ام موزون   نہ غزل نی قصیدہ ای دارم ۱۳۵

(تذکرہ شعراء پنجاب، ص۳۸۳)

خواجہ کرنل عبدالرشید نے ان کے دیوان سے کچھ اشعار اپنے تذکرہ میں لکھے ہیں۔ جن سے ان کی شاعرانہ خوبی معلوم ہوتی ہے۔

دیدم بہ کتب خانہ ہفتاد و دوملت   غیر از سخن عشق نشد منتخب ما

واقف ردھان وکمر یار چہ می پرسی   از ہیچ خبر نیست من ہیچمدان ما

چو شمع قصہ سوز و گداز می خوانم   بہ محفلی کہ نفہمد کسی زبان را ۱۳۶

(ایضاً)

شاعر کے جو حالات ہم نے بیان کئے ہیں اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ انہوں نے شعروشاعری کے علاوہ کوئی اور معاشی ذریعہ اختیار کیا ہے یا نہیں، البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری عمر عزیز کو شاعر نے شعروادب کو اپنے دل سے لگائے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واقفؔ کا دیوان بہت ضخیم نظر آتا ہے۔ واقفؔ کی شاعری میں اتنی رنگینی موجود ہے کہ ملک الشعراء کابل نے واقفؔ کے اشعار پڑھ کر ایک رباعی کے ذریعے اس کی شعرگوئی کی بے انتہا تعریف کی ہے۔ رباعی مندرجہ ذیل ہے۔

ای آنکہ نظام گلشن کوئینی   در نظم سخن یگانہ دارینی

دو راز تو بدیدہ نور مارا نبود   خود واقفی ای دوست کہ نورالحسینی۔ ۱۳۷

(پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ص۲۷۴)

شاعر کو اپنے فن پر کس قدر فوقیت حاصل تھی آزادؔ بلگرامی کے اس بیان سے کہا جاسکتا ہے کہ واقفؔ نے اس سے بتایا ہے کہ شاعر موصوف کو ایک دن مصرع موزوں ہوا،

''ای چراغت بکف از رنگ حنا زود بیا'' لیکن دوسرا مصرع نہیں آیا۔ اسی طرح دماغ پر زور ڈالتے چھ ماہ

گذر گئے آخر چھ ماہ بعد دوسرا مصرع لگا جو یہ تھا۔

''دل دستم بہ شبستان غمت گم گردید''۔ ۱۳۸

(خزانہ عامرہ، ص، ۴۵۰)

نا مساعد حالات کے سبب واقفؔ کی عمر کا زیادہ حصہ وطن سے دور سفر میں گذرا۔ اس غریب الوطنی کی حالت سے شاعر کے ذہن پر گہرائے اثرات مرتب کئے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ واقفؔ کا کلام قاری کو ایک نئی لذت سے آشنا کرتا ہے شعرائے معاصرین کے برعکس واقفؔ کے ہاں دو اشعاروں ''وطن اور سفر'' کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ شاعر نے ان کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

ز دست عزیزان وطن می گذارم	وطن گر بہشت است من می گذارم
دیدتا ثابت قدم بر جادہ سودا مرا	برندارد یک نفس زنجیر ہم از پا مرا
نکشد یار از غرور مرا	کشتن خویش شد ضرور مرا ۱۳۹

(خزانہ عامرہ، ص، ۴۵۲)

واقفؔ بٹالوی نے فلسفہ حیات پر بھی روشنی ڈالی ہے انھوں نے دنیا کو جائے فنا قرار دیا ہے ان کی نگاہ میں دنیا ایک زن پیر ہے جس سے دل نہ لگانا چاہیے۔ زندگی ایک خوب ہے جس کو انسان تمام عمر دیکھتا رہتا ہے اس قسم کے دیگر خیالات کو ابو سعید نے اپنی رباعیات میں جگہ دی ہے۔ ان کی فنا اور بے ثباتی دنیا کی رباعیات اپنے سوز و گداز کی وجہ سے ہمارے دل پر ایک گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ نمونہ کے طور پر رباعی درجہ ذیل ہے۔

نا نمودی از مسی رنگین دہان تنگ را	ساختی تاریک در چشم جہان تنگ را
چند روزی شد ز کویش رفتم و یادم نکرد	گر چہ یاد آرند اکثر نو ز دنیا رفتہ را

اس کے علاوہ شاعر نے رباعیوں میں خدا کی وحدت، اس کی عظمت، انسان کی عاجزی اور اس کی عقل کی کوتاہی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ بعض رباعیات میں خدا سے اپنے گناہوں کی بخشش کے لیے بھی دعا مانگی ہے۔

سر در وان من گذری کن بسوئے من	تا آب رفتہ باز بیاید بجوئے من
جانمن از خودی جدائی کن	بندگی کردۂ خدائے کن۔ ۱۴۰

(خزانہ عامرہ،ص،۴۵۴)

شعراء فارسی کے ہاں عشق کا موضوع قدیم ترین ہے شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جس کے کلام میں عشق کے مضامین نہیں ملتے ہوں گئے۔مگر یہ موضوع اپنی قدامت وتکرار کے باوجود حیات ابدی اور تازگی کا حامل ہے۔کیونکہ ازل سے آج تک انسانی فطرت وہی ہے اس کے دل کے تقاضے وہیں اس کے احساسات وجذبات بھی وہی ہے یہی باعث ہے کہ یہ موضوع ہر عہد اور ہر قبیل کے شعراء کے ہاں موجود ہے لیکن فرق صرف زاویہ نظر کا اور دقت نظر کا ہوتا ہے۔ ہر شاعر نے اپنے ایک مخصوص اندازِ بیان سے تصوف کو بیان کیا ہے۔جس کی بدولت شاعر کی پہنچان شخصیت قاری کے سامنے آتی ہے۔واقفؔ نے بھی اس موضوع کو نہایت خوبی اور رنگینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔نمونہ کے طور پر رباعی پیش کرتا ہوں۔

(۱) آں طبع کہ باشد بشرارت ہمدم — ازصحبت پاکاں نشود کینش کم
پیداست کہ کار او ہماں سوخت است — ہر چند کہ آتش بود از سنگ حرم

(۲) صبا با زلف یار من چہ کردی — زدی برہم قرار من چہ کردی
مکدر گر نہ گردی با تو گویم — کہ با مشت غبار من چہ کردی

ترجیع بند میں شاعر موصوف نے اس طرح تصوف کو یوں بیان کیا ہے۔

ای زلف تو عنبرین کمندی — درعہد تو ہر دل دلی بہ بلندی
ای سرو قد از کدام باغی — پست است ہر تو بلندی۔۱۴۱

(تذکرہ شعرائے پنجاب،ص۳۸۵)

واقفؔ کی شاعری روایتی شاعری کا نمونہ ہے محبوب کا حسن وسراپا،اس کے ناز وادا،ہجر ووصال،خمریات اور زاہد پر طنز جیسے روایتی مضامین شاعر کے کلام میں موجود ہے۔تجربات زندگی کا بیان اور عصری حیثیت ہے اس کے طرز بیان میں معنی آفرینی،شوخی،قادرالکلامی،محاورات اور آرایش لفظی وغیرہ قابلِ ذکر اوصاف ہیں۔تکرار مضامین بھی ان کے کلام میں کافی نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ قرر ئے شوقیانہ پن بھی موجود ہے۔مندرجہ ذیل رباعی سے واقفؔ کے کلام کی رنگینی معلوم ہوتی ہے۔

ہر گل کہ بعد مرگ بروید ز خاک من — باشد نمونہ ای ز دل چاک چاک من
صبح چون بی پردہ شد بر خویش لرزدم چراغ — دیدنی دارد ز رویت اضطراب چشم من۱۴۲

(تذکرہ شعرائے پنجاب، ص ۳۸۵)

واقفؔ نے رباعیوں کے ذریعے دل کی اہمیت اور افادیت کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دل کو صرف بازگشت کا پارہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کی گہرائی بہت ہوتی ہے۔ ایک دل کو خدا سے سیدھا تعلق ہوتا ہے اور انسان اگر چاہیے تو دل میں ہی جلوہ نور الٰہی دیکھ سکتا ہے کیونکہ بندگان آزاد کے دل تو خدا کا مقام ہوتا ہے۔

(۱) در نظر چون سایہ شمشاد می آید — سر بپای یار سودن یاد می آید
ای ہم آواز خشکی طالع کہ درین عندلیب من کنید — بوی گل از جامۂ صیاد می آید

☆☆☆

(۲) جانا شدہ بدیدن خود محتاج — او تافتہ بیماری چشمت بمزاج
بایدایں در رفتہ زا را کردن — از طلب سکندری آئینہ علاج۔۱۴۳

(خزانہ عامرہ، ص ۴۵۲)

شاعر موصوف کے مذکورہ اشعار کے علاوہ اور بھی بہت سے نمونے آزاد بلگرامی نے اپنے تذکرہ ''خزانہ عامرہ'' میں شامل کئے ہیں، ان میں چند اشعار میں نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں جن میں شاعر نے خدا کی وحدانیت بیان کی ہے۔

(۱) چون نی نساخت ہمدمی ہیچکس مرا — نالم اگر مسیح شود ہم نفس مرا
نو آمدم بدام تو زودم چہ میکشی — بگذار یکدروز بہ کنج قفس مرا

☆☆☆

(۲) درکف من قلم نرگس نیست — زین چمن چشم رسیدہ است مرا
بر مصور پسری حیرانم — کہ چو تصویر کشیدہ است مرا

☆☆☆

آہ از خشکی طالع کہ درین فصل بہار — سیل تشریف نیاز رد بویرانۂ ما
گریز گاہ بود این دل پریشان را — خدا زیادہ کند عمر زلف جانان را

چون سالکان براہ طریقت نہند پا	ہمچون عصا ز چوب تراشند رہنما

خواہم سعادتی ز طواف قفس برم	درنہ چہ حاصل است ازین مشت پر مرا

آنقدر بادی کہ زخم کہنہ مانوشود	آرزو زان خامہ مشکین رقم داریم ما

واقفؔ نے اپنے کلام میں دیگر شعراء کی پیروی کی مثلاً انہوں نے بوعلی شاہ قلندر، حالی کے طرز سخن کو بہت پسند کیا۔ مضمون آفرینی اور اور تازہ گوئی میں ان کو اہم مقام حاصل ہے۔ واقفؔ نے غزلیات کے ساتھ ساتھ رباعیات میں بھی مضمون آفرینی کے تانے بانے باندھے ہیں۔

☆☆☆☆

غلام قادر گرامیؔ جالندھری

ملک الشعراء مولانا غلام قادر گرامی فارسی گویان کے سلسلے کی آخری کڑی مانی جاتی ہے۔۲۷ سال دکن کے دربار میں رہے۔کیونکہ اعلیٰ حضرت کے ساتھ ان کی گہری وابستگی تھی۔ اور وہی سے آپ کو''شاعرِ خاص''اور''ملک الشعراء'' کا خطاب ملا۔ادبی دنیا میں گرامی جالندھری کے نام سے مشہور ہے۔غلام قادر گرامی جالندھری کی شخصیت اتنی عظیم ہے، کہ اہل ہند اور خاص کر پنجاب کے عوام کو ان کی عظمت و رفعت پر فخر ہے۔اہل پنجاب نے ان کی ذات پر ہر وقت ناز کیا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں انسانیت کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کی اور عروسِ انسانیت کی مشاطگی کے لیے خود کو ہمیشہ وقف رکھا تھا۔ان کے نظریات و خیالات آج بھی انسانیت کی تعمیر میں سرگرم ہیں ۔گرامی کے خیالات کو آفاق گیر سمجھا جاتا تھا۔وہ تنگنائی پنجاب و ہند میں ہی محدود نہ رہ سکے۔اہل ہند و اہل ایران کی طرح انہوں نے ادب شناس و مفکرینِ عالم کی توجہات کو اپنی طرف کھینچ لیا۔گرامی جالندھری کے اہل پنجاب پر کافی گہرئے اثرات پڑے۔تقریباً پورے ہند کے عوام نے خیالات و نظریات کو سمجھنے میں بڑے ذوق وشوق اور انہاک کا ثبوت دیا۔کئی اشخاصِ پنجاب نے گرامی کے حالاتِ زندگی کو قلم بند کیا اور گرامی جالندھری کے بہت سے پہلوؤں کو روشناس کرایا،جن میں طارق کفایت کا نام بڑی عزت واحترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ بیرون ملک کے ادب شناس لوگ جالندھری کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔انھوں نے گرامی جالندھری کی شعری حیات کے متعدد پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے ادب شناسوں نے ان کی عرفانی شاعری کی نقاب کشائی کر کے عوام وخواص کو بہت قریب کرنے کی جد وجہد کی۔

غلام قادر گرامی جالندھری کی سنہِ پیدائش کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں۔جس کی وجہ سے کچھ لوگ گرامی جالندھری کی سنہِ ولادت ۱۸۵۶ء اور کچھ ۱۸۵۷ء کہتے ہیں۔ان سب کا جائزہ لینے کے بعد یہ طے ہوا ہے کہ گرامی جالندھری ۱۸۵۶ء یا اس سے ایک دو سال پہلے پیدا ہوئے تھے۔آپ کے والد محترم کا نام شیخ سکندر بخش تھا۔خود انہوں نے اپنے فرزند کا نام

غلام قادر رکھا ہے اور اس پر گرامی جالندھری کو ہمیشہ فخر رہا۔ گرامی جالندھری نے خود اپنے نام کے بارے میں لکھتے ہیں:

''غلام قادر فرخند نامم گرامی غوث اعظم را غلامم'' ۱۴۴؎

(دیوان گرامی جالندھری، ص ۱۴۴)

ابتدائی تعلیم محلے کی مسجد میں حاصل کر کے خلیفہ ابراہیم کے مکتب میں داخلہ لیا۔ مکتب میں ہی خلیفہ ابراہیم نے گرامی جالندھری کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو پہچان لیا۔ بعد از اں تحصیل علم کے شوق میں آپ نے اورینٹل کالج میں داخلہ لیا۔ وہاں آپ نے منشی عالم اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔ وکالت کی ڈگری حاصل کی، لیکن وکالت کو پیشہ کے طور پر کبھی بھی نہیں اپنایا اور امرتسر میں مدرس کے طور پر کام کرنے لگے، پھر یکے بعد دیگرے ملازمت کے سلسلے میں جالندھر، کپورتھلہ، لدھیانہ اور مالیر کوٹلہ بھی پہنچے۔ نازک مزاج ہونے کی وجہ سے کسی بھی ملازمت سے مطمئن نہ رہوئے۔ پھر پٹیالہ کے وزیر اعظم نے مشورہ دیے کر ان کو دکن جانے کے لیے کہا، لیکن گرامی جالندھری کے مالی وسائل اتنے نہیں تھے کہ وہاں جا سکے، مگر تقدیر میں ان کا دکن جانا منظور تھا، اس لیے یکے بعد دیگرے اسباب مہیا ہونے لگے۔ اس سلسلے میں کئی روایات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک یہ کہ گرامی جالندھری نے داتا گنج بخش کے آستانے پر حاضری دیکر ایک منقبت لکھی، جو بہت مقبول ہوئی اور آپ کو خواب میں دکن جانے کی بشارت ملی۔ اسی طرح حضرت معین الدین چشتیؒ کی شان میں منقبتوں کا سلسلہ ''پیسہ اخبار'' میں شائع ہوا تھا۔ گرامی جالندھری نے بھی منقبت کہی جو مقبول ہوئی اور آپ کو آخر دکن جانا نصیب ہوا۔ دکن جا کر انہیں پنجاب کے وزیر اعلیٰ خلیفہ محمد کی سفارش کی وجہ سے وہاں کے دربار میں بہت جلد رسائی ممکن ہوئی۔

آخر کار ذیابطیس سے آپ کو آخری دم تک نبرد آزما رہنا پڑا اور اسی کے سبب ۱۹۲۷ء کی درمیانی شب کو اپنی جاں جان آفرین کے سپرد کر دی اور ہوشیار پور کے قبرستان کندن شاہ بخاری میں دفن کئے گئے، جو حضرت نور جمال الدین کے مزار کے بالکل نزدیک ہے۔ گرامی جالندھری نے آخری وقت صرف ایک وصیت کی تھی جس کو طارق کفایت نے اس طرح رقم

کیا ہے:

''گرامی نے اپنی ایک نعت اور رباعی قبر میں
اپنے ساتھ دفن کرنے کی وصیت کی تھی مگر دفن
کے وقت وصیت یاد نہ رہی تو بعد میں یہ دونوں
چیزیں سرخ پتھر پر کندہ کرا کئے آپ کے مزار پر
لگوادی کی گئیں اور یہ پتھراب بھی موجود ہیں۔
۱۴۵''

(ملک الشعرا گرامی جالندھری،ص۱۴)

مولوی عبدالحق نے گرامی کی شخصیت و کردار کے بارے میں اس طرح بیان کیا ہے:

''کبھی بھی خیال نہیں ہوا کہ شاعر موصوف ایسا
صاحب ذوق شخص تھا اگر چہ مدتوں دوآبہ
گنگوجمن میں رہا مگر لب ولہجہ سے ٹھیٹھ پنجابی
تھا۔''۱۴۶

(چند ہم عصر،ص ۵۸۔۵۷)

مولانا گرامی جالندھری بہت زندہ دل اور نازک مزاج کے شخص تھے۔سادگی آپ کی زندگی کا خاصہ تھا دربار سے لوٹ کر ڈھیلا ڈھالا لباس پہن کر مسند پہ تکیہ لگا کر بیٹھ جاتے ،حقہ پینے کے ساتھ فکر شعر میں بہت مصروف رہتے تھے۔بہت دیر تک عالم محویت میں خود گنگناتے رہتے اور پھر مسلسل طور پر ان کے ذہن سے اشعار تخلیق ہوتے تھے۔عزیز ملک صاحب یوں رقم طراز ہیں:

''گرامی پر ہمیشہ استغراق کی سی کیفت طاری
رہتی، جیسے نشے میں ہوں ۔ بجھے ہوئے حقے کو
منہ سے لگی رہتی اور دماغ فکر سخن میں ہوتا،
عقیدت مند شاگرد اور احباب محفل میں بیٹھے

ہوتے ،لیکن مولانا کوسوا اور ما سوا کی مطلق خبر
نہیں ہوتی ۔ایسے میں کوئی مخاطب نہیں کر لیتا تو
عالم بلا سے یوں پلٹتے جیسے خواب گراں سے
چونکے ہیں ۔،،[۱۴۷]

(ملک الشعرا گرامی جالندھری،ص۱۴)

گرامیؔ جالندھری کی عادت تھی کہ رات کے آخر میں بیدار ہو جاتے اور فکر سخن میں مصروف ہو جاتے ۔ان کی طبیعت بہت رواں تھی۔ شعر پر شعرا نکے ذہن میں آتے اور اپنی لڑکی کو لکھواتے تھے۔شعر وشاعری کے سوا اُن کا کوئی کام نہ تھا۔شعر گوئی پر ہی آپ کی زندگی کا دارو مدار تھا آپ کی عمل زندگی میں بھی شعر گوئی کو کافی دخل تھا۔اس کا انداز اس بات سے کیا جاتا ہے کہ منشی فاضل کے امتحان میں چند سوالوں کے پورے کے پورے جواب شعر میں ہی دئے ۔اسی طرح بعد میں ایک مقدمے میں اپنا جواب دعویٰ فارسی نظم میں پیش کیا۔عبدالمجید سالک نے علامہ اقبالؔ کی رائے کو گرامیؔ جالندھری کے بارے میں اس طرح بیان کیا ہے:

''گرامی شعر میں تلمیذ روح الامین ہے اور باقی
معاملات میں چغد ۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری
فرماتے ہیں فنا فی اللہ لوگ شائد بہت ہونگے
لیکن فنا فی الاشعر جسے کہنا چاہیئے وہ میری
دانست میں گرامیؔ جالندھری ہی تھے۔''[۱۴۸]

(مخزن،شمارہ گرامیؔ جالندھری،اگست ۱۹۲۷ء،ص۱۵)

گرامیؔ نے فارسی ادب کے تقریباً سبھی اصناف ادب پر طبع آزمائی کی ۔لیکن زیادہ توجہ ان کی غزل گوئی اور رباعی گوئی کی طرف رہی ہیں۔اس بات سے رباعی گوئی کے لگاو کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے کہ جالندھری نے انتقال کے وقت اپنے ساتھ رباعی ڈالنے کو کہا ہے ۔شاعر کو جو معیار رباعی کہنے کے لیے چاہیئے وہ گرامیؔ کے اندر بہ خوبی موجود تھا۔رباعیات پر گرامیؔ نے عمر عزیز کے آخر میں قلم کشی کی ۔ان کے تقریباً تین سو رباعیات مطبوعہ مجموعوں میں

شامل ہے۔رباعی کہنے کے لیے جس گہرے مشاہدے اور صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلاشک وہ مرتبہ گرامیؔ نے حاصل کرلیا ہے۔اس لیے ان کی رباعیوں میں زیادہ ٹھراو، زیادہ متانت اور زیادہ گہرائی و گیرائی ہے۔ بیشتر رباعیاں واردات قلبی کی مظہر معلوم ہوتی ہیں۔

درسِ ماضی از کتاب حال گیر　　　ساغر از خمخانہ اقبال گیر
حضرت اقبال آں بالغ نظر　　　وارداز بود و نبود ما خمیر

شاعر کا خیال ہے کہ پروردگار نے انسان کو دو عظیم چیزوں سے نوازا ہے، مثلاً روح اور جسم۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہے۔ایک کی کمی کے بغیر انسان ناتوان ہونے سے بدتر ہے۔ایک رباعی میں شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

ای روح بجسم گوشہ گیری تا چند　　　درگرسنگی دماغ سیری تا چند
ای روح مقام تست عرشِ اعظم　　　در دام گہ بلا اسیری تا چند۔۱۴۹

(گرامیؔ جالندھری، شخصیت اور فن،۱۸۶)

شاعر کے مطابق موت ہی روح کی آزادی ہوتی ہے۔

دادست مرا زبان الہام خبر　　　درجوہر مرگ زندگانی مضمر
بگرفت رہ خانہ خود جوہر　　　از قید نجات یافت ہر بشر

مذکورہ رباعیوں کے علاوہ شاعر نے دنیا کی بے ثباتی پر اس صنف سخن کا استعمال کیا ہے۔ان کے مطابق یہ دنیا دھوکہ اور فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔اس چار دن کی چاندنی میں انسان کو چاہیے کہ وہ کارہائے نیک انجام دیں۔ وہی نیک کام مستقبل میں نجات دلانے کا کام آئیں گی۔

این عمر کہ ہست در عذابی دگرست　　　آئیندہ ورفتہ راحسابی دگرست
مکسل از حالی و ماضی و مستقبل　　　درگردش روح انقلابی دگرست

☆☆☆

عمر کردم باوج معنی پرواز　　　نشنافتم ای وای حقیقت زمجاز
در پردہ ز پردہ دہندم آواز　　　کوتاہ چنین وعمر وامیدست دراز۔۱۵۰

(پنجاب کے برگزیدہ غزل گو،ص ۱۸۷)

گرامی نے رباعیوں کے ذریعے دل کی اہمیت اور افادیت کو بیان کیا ہے۔وہ کہتے ہے کہ دل کو صرف گوشت کا پارہ نہیں سمجھنا چاہئے۔اس کی گہرای بہت ہوتی ہے۔ایک زاہد کے دل کو خدا سے سیدھا تعلق ہوتا ہے۔اور وہ اگر چاہئے تو اپنے دل میں ہی جلوہ نورالہٰید یکھ سکتا ہے کیونکہ بندگان آزاد کے دل تو خدا کا مقام ہوتے ہیں۔

تا چند دارد گیر تقلید   تا چند فسون قصہ وبیم امید

در پہلوی تست گر بخو دنگری   آئینہ سکندر و جام جمشید

دوسرے شعراء کی طرح گرامی کو بھی عشق رسولﷺ پر کافی یقین ہے۔ان کی آخری عمر عزیز عشق کی انتہا میں گزری۔اس کا اظہار رباعیات میں خوب ملتا ہے۔اس بات پر بھی بہت عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضورﷺ نبیوں کے سردار اور اسکی صفات قدسی کا مجموعہ ہے۔مثلاً

زا سرارِ خفی شرح دہم چہ بوالعجبی است   زانوارِ جلی سخن کنم بی ادبی است

گفتند ولی خلیل و داوٗد و کلیم   شاہنشاہ انباء رسول عربی است

پیغمبر ما کہ ابنیاء راست امام   جبرئیل آوردش از خداوند پیام

بودش بہ مکم فطرت آنجام آغاز   در دائرہ نبوت آغاز انجام

شاعر کہتا ہے کہ میرا دل گناہوں سے بہت غمگین ہو چکا ہے۔کیونکہ میں نے دنیا میں بہت گناہ کئے تھے۔لیکن اس کے باوجود بھی میرے رسول نے میرے دل میں ایک کرن ڈال کر تابناک کیا۔

خاور چکدشم بایل تیرہ شبی   کوثر چکد از لبم بایں تشنہ لبی

ای دوست ادب کہ درصریم دل ماست   شاہنشہ انبیاء رسول عربی

غلام قادر گرامی جالندھری کے نزدیک عشق ایک ازلی جذبہ ہے۔کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہی عشق کی تخلیق بھی ہوئی۔انسان نے اس دنیائی رنگ و بو میں قدم رکھا تو عشق کا تصور بھی اُسے وراثت میں ملا۔لفظ عشق کی مختلف تاویلات ازل سے ہی کی جارہی ہے اور ابد تک کی جاتی رہے گی۔انسان اپنے نقطہ آغاز سے ہی اس جذبہ کی اصل کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔دنیا بھر کی ادبیات عشق کے موضوع پر لکھی گئی نگارشات سے بھری ہوئی ہیں۔بالخصوص

شاعری کا یہ محبوب ترین موضوع پُر شاہکار تصنیفات میں لکھا گیا ہے۔ فارسی ادب بالخصوص فارسی شاعری اسی موضوع کی بہت مرہون منت ہے۔ شاعروں نے ابتدا ہی سے اس کی تشریح کی طرف توجہ دی ہے۔ صوفی شعرا کے ہاں تو یہ لفظ کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا گرامؔی جالندھری اوران کے کئی معاصرین ہم مشرب عشق کو زندگی کی قوت محرکہ خیال کرتے ہیں۔ جس کے ذریعے زندگی ذوق تخلیق اور لذت ارتقاء سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ عشق کی ولولہ انگیز رہنمائی میں انسان زندگی کے ارفع نصب العین یعنی مبدا اصلی تک رسائی میں کامیاب ہوتا ہے۔ بعد میں آنے والے تمام فارسی شعرا نے بغیر کسی تمیز و امتیاز کے عشق کو اپنا موضوع سخن بنایا اور ہر ایک نے اس لفظ سے جو مفہوم، معنی مراد لیا وہ خالصتاً اس کے نجی مشاہدات اور قلبی احساسات سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ہر ایک نے اپنی واردات ہی کو عشق کا نام دیا۔ ہر ایک کے ہاں یہ نئی صورت میں جلوہ آرا ہے۔ اسی لئے کئی شاعروں کے عشق کا مفہوم متعین کرنے کے لئے اسے شاعروں کی جملہ شاعری کے سیاق وسباق میں دیکھنا چاہیے۔ گرامؔی جالندھری کے درجہ ذیل اشعار کو ملاحظہ فرمائیں:

وفا دشمن رہ عاشق نوازی برنمی گیرد

ہر دو رفیق در ازل ہر دو شفیق در عمل

چہ برگیرم کہ آہ آتشینم برنمی گیرد

عشق وفا خمیر ما عقل ادب سرشت ما۔[151] (ملک الشعرا گرامؔی جالندھری، ص ۳۲)

گرامؔی جالندھری کا عشق جس نمایاں صفت سے متصف نظر آتا ہے وہ ہے وفاداری اور خلوص۔ آپ سے ایسا ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ وفاداری خود شاعر کا ذاتی مسلک بھی ہے۔ وفا ناآشنا شخص کبھی عاشق ہو ہی نہیں سکتا۔ شاعر کی نظر میں عشق و عاشقی کی دنیا سب سے الگ ہوتی ہے، جہاں موت زندگی دکھائی دیتی ہے اور نا اُمیدی اُمید بن جاتی ہے۔ اول تو یہ کہ موت وحیات اور امید و یاس کا امتیاز ہی عشاق کے لئے باقی نہیں رہ جاتا۔ اگر اُمید کا شعور واحساس باقی بھی ہو تو نا اُمیدی کی کیفیت اس قدر شدید ہوتی ہے کہ وہی امید بن جاتی ہے۔ اسی طرح انتہائی مصائب کے عالم میں عاشق کا آخری سہارا موت ہی رہ جاتا ہے۔ وہ زندگی سے بڑھ کر موت کی تمنا کرتا ہے۔ مثلاً:

(۱) درصبح ازل زنیست ہستم کردی — درجذبہ عقل وعشق مستم کردی
در بی خودی عشق زہوشم بردی — درمستی عقل خود پرستم کردی

(۲) شان نگاہِ رابا غی دگرست — شبہای امیدراچراغی دگرست
باشحنہ عقل بی دماغی کردم — دیوانہ عشق رادماغی دگرست ۱۵۲

(رباعیات گرامی،ص ۱۷۷)

بیشتر اشخاص جودنیاداری میں نہایت تجربہ کار ہوتے ہیں،لیکن وہ عشق کے معاملات میں انجان ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو قدرت نے وہ دل ہی نہیں دیا، جوعشق میں مبتلا ہونے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو

''رموزعشق گرامی جالندھری آچہ می داند
چہ پختگان کہ درین راہ خام کارانند''

بہرحال گرامی جالندھری فارسی کے ایک مستند شاعرگذرئے ہیں۔ان کی شاعری سے مولانا رومی کی قادرالکلامی ،کہنہ مشقی اور پختہ گوئی ظاہر ہوتی ہے۔ان کو الفاظ پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔شاعرنے اپنے اخلاقی شاعری کے ذریعے انسانیت کوپستی سے نکالنے کی بے حدکوشش کی تھی۔ ملک الشعرا گرامی ہندوستان میں فارسی شاعری کےعظمتِ رفتہ کے یادگار تھے۔لیکن اس قابلِ احترام شاعرکوداد ورس نہیں دی گئی جس کے وہ مستحق تھے کیوں کی اس وقت فارسی کا بول بالا بہت کم ہو چکا تھا۔گرامی کے شعری کارناموں پر پردہ پڑ گیا اورآپ کے حصے میں اس شہرت ونمود کا عشرِعشیر بھی نہیں آیا۔ گرامی کوتخلیقی جوہر پروازِ تخیل فنی دسترس فکری میلانات اورشعری نظریات پر بہت قابوتھا۔ بیسویں صدی کے اس معروف فارسی شاعر نے پنجاب کی تعریف وتوصیف یوں بیان کی ہے:

برآمدلفظ پنجاب اززبانم
زبان شُدموج کوثر دردھانم

علامہ اقبال

شاعرمشرق علامہ اقبال ادبیات کی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے۔ خاص کر فارسی ادبیات کی تاریخ میں ترجمانِ حقیقت، شاعرفلسفی کا نام درخشاں ستارے کی مانند ہے۔ ان شخصیتوں میں علامہ اقبال کا نام سرفرست ہے جنہوں نے پورے ملک وقوم کو بیدار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا اور عالمی سطح پر اپنی پہچان بنانے کا جذبہ پیدا کیا۔ علامہ اقبال کشمیرالاصل تھے۔ وطن سیالکوٹ ہے مگر زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں بسر کیا۔ اس بناپر ایرانی انہیں ''لاہوری'' کہتے ہیں اور لاہوری اس کی شناخت بن گئی۔ اقبال کی تاریخ ولادت کے بارے میں مختلف تذکرہ نگاروں نے مختلف لکھا ہے۔ کچھ مصنفین آپ کی تاریخ ولادت ۲۲ فروری ۱۸۷۲ء بتاتے ہیں۔ بزم اقبال کے مطابق لاہور والے ۲۹ دسمبر ۱۸۷۲ء پر اصرار کر رہے ہے۔ مگر زیادہ محققین اقبال اکادمی کراچی کے تاریخ پر متفق ہے۔ فارسی ادب کی مختصرترین تاریخ میں علامہ اقبال کی تاریخ ولادت کے بارے میں یوں ذکر ہے۔

> ''ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کشمیرالاصل تھے۔ اقبال اکادمی کراچی کے ارباب کو ۹ نومبر ۱۸۷۷ء پر اصرار ہے دیکھیں آپ کی تاریخ ولادت پر قوم کو کب اتفاق ہوگا'' ۱۵۳
>
> (فارسی ادب کی مختصرترین تاریخ، ص۳۳)

علامہ اقبال کی تاریخ ولادت پر کرنل عبدالرشید یوں رقم طراز ہے۔

> ''اقبال در ۹ نومبر ۱۸۷۷ میلادی مطابق ۱۲۹۴ھ در شہر سیالکوت درمیان خانوادہ مستوسط الحالی بجہان آمد۔ جد اقبال محمد رفیق یکی از سکنہ قریہ لوی ھار بود باتفاق سہ برادرش از کشمیر، زادگاہ اجدادی خویش مہاجرت کردہ در شہر سیالکوت اقامت گزیدہ بود۔ نور محمد پدر اقبال کہ در موقع ولادت وی در شہر سیالکوت مشغول اموز بازرگانی بود۔ از جہت علاقہ شدیدی کہ باموررو حانی داشت، مرد بسیار متدینی شناختہ می

شود۔''۱۵۴؎

(تذکرہ شعرائے پنجاب،ص۵۳)

اقبال نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔علوم اسلامی کے لیے انہیں حضرت مولانا سید میر حسن جیسا بے بدل فاضل استاد میسر آیا تھا۔بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگری انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھ کر حاصل کئے۔عربی اور فلسفہ ان کے خاص مضامین تھے۔مگر فارسی آموزی کی خاطر بھی انہیں نے بے حد محنت کی ہے۔ اقبال شروع سے ہی ذہین تھے۔لاہور کے مشاعروں میں بچپن سے ہی شرکت کرتے تھے۔خواجہ عبدالرشید علامہ اقبال کی ابتدائی شاعری کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔

''اقبال پس ازطی دورہ دبستان برای گذراندن دورہ ای متوسطہ وارد۔اسکاچ مشن کالج دربہمن اوقات بود کہ بعضی از اشعاررا کہ اکثر غزل بود برای تصیح نزد شاعر معروف اردو بہ تخلص بہ''داغ''میفر ستاد''۱۵۵؎

(تذکرہ الشعرائے پنجاب،ص،۵۳)

۱۹۰۵ءاورنٹیل کالج اور گورنمٹ کالج لاہور میں تدریس کی۔اسی دوران علامہ اقبال نے ''علم الاقتصاد'' کے عنوان سے کتاب لکھی اور چھپوائی (۱۹۰۳ء) مذکورہ سال میں آپ یورپ تشریف لے گئے اور تین سالہ قیام کے دوران جرمنی سے ڈاکٹریٹ اور لندن سے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کی طبعیت بچپن سے ہی شعر وادب کے لیے موزوں تھی۔کم سنی میں ہی سیالکوٹ کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ۱۹۰۵ء میں یورپ کے سفر کے ساتھ فارسی شاعری کا باضابطہ آغاز ہوگیا۔کتاب''اقبال کی شخصیت اور شاعری'' میں واضع طور لکھا گیا ہے کہ علامہ اقبال کو انگلستان کی ایک شعری محفل میں فارسی شعر کہنے کی دعوت دی گئی۔علامہ نے واپس جواب دیا کہ آج تک میں نے فارسی میں ایک آدھ شعر کے سوا کچھ نہیں لکھا۔وہی سے علامہ اقبال کی شاعری میں تڑپ پیدا ہوگئی۔ڈاکٹر طارق

کفایت نے اپنے مقالے میں علامہ اقبال کے بارے میں یوں ذکر کیا ہے۔

''علامہ اقبال کے دل میں ایک زبردست تحریک فارسی شعر لکھنے کی پیدا ہوئی۔صبح تک دوغزلیں تیار ہوچکی تھیں اور انگلستان سے واپسی تک تو اقبال کا باقاعدہ رجحان فارسی شاعری کی طرف ہو چکا تھا۔''۱۵۶

(پنجاب کے برگزیدہ غزل گو،ص،۳۲۰)

اس کے بعد علامہ اقبال کی مکمل توجہ فارسی شاعری کی طرف مبذول ہوئی تھی علامہ اقبال نے اپنے خیالات ونظریات کے اظہار کے لیے فارسی کو اردو پر ترجیح دی۔شاعر موصوف نے خود چند اشعار بیان کیا ہے کہ فارسی کو اپنے لیے کیوں موزوں پایا ہے۔

گرچہ ہندی درعذوبت شکراست	طرز گفتار دری شیرین تر است
فکر من از جلوہ اش محور گشت	خانہ من شاخ نخل طور گشت
پارسی از رفعت اندیشہ ام	درخود بافطرت اندیشہ ام

پروفیسر حمید خان نے ایک بار علامہ اقبالؔ کو فارسی کے بارئے میں سوال کیا تھا علامہ نے یوں جواب دیا:

"it comestible in persian" 157 (اقبال کی شخصیت اور شاعری،۴۵)

مولانا گرامیؔ جالندھری کے نام ایک مکتوب پیش کیا تھا جس پر یہ ذکر درج تھا۔

''فارسی کی طرف میلان زیادہ ہوجاتا ہے وجہ یہ ہے کہ دل کا غبار اردو میں نہیں نکال سکتا''۱۵۸

(مکاتیب اقبال بنام گرامیؔ،ص۹۹)

اس کے علاوہ محمد رفیق افضل نے اپنی کتاب ''گفتار اقبال'' میں شاعر کے رجحانات کو اس طرح بیان کیا جن کی وجہ سے وہ فارسی شعروادب کی طرف راغب ہوئے:

''مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج میں یہ راز بتادوں کہ میں نے کیوں فارسی زبان میں شعر کہنے شروع کیے،بعض اصحاب

یہ خیال کرتے ہیں کہ فارسی زبان میں نے اس لیے اختیار کی
کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں۔ حالانکہ
میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا۔ میں نے اپنی مثنوی
اسرار خودی ابتداً صرف ہندوستان کے لیے لکھی تھی اور
ہندوستان میں سمجھنے والے بہت کم تھے۔ میری غرض تھی کہ جو
خیالات میں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں
،اس وقت مجھے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ یہ مثنوی ہندوستان کی
سرحدوں سے باہر لے جائے گی۔ بلا شک یہ صحیح ہے کہ اس
کے بعد فارسی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور میں اس زبان
شعر کہتا رہا''[۱۵۹]

(گفتارِ اقبال،ص،۲۵۰)

یہ کچھ موثر واقعات ہیں جنکی بدولت علامہ اقبال کا رجحان شادمانگی سے فارسی شعر و ادب کی طرف ہوا۔ ڈاکٹر عبدالشکور احسن نے بھی اپنی کتاب ''اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ'' میں اس واقعی پس منظر پر روشنی ڈالی۔

''یورپ میں علامہ کو تہذیب نو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا
تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ یورپ کی ہوس ملک گیری ،
ملوکانہ حکمت عملی پر گامزن مغربی طاقتوں کی سرتوڑ رقیبانہ
کشمکش ،اس سفاک اور غیر انسانی نظام کو برقرار رکھنے کے
لیے ہر ممکن غیر اخلاقی اور انسانیت سوز حربہ اور مادیت کی
پرستش نے تہذیب مغرب کو ایک ہلاکت خیز دور ہے پر لا کھڑا
کیا ہے دوسری طرف اقوام مشرق کی درماندگی اور بیدار دانہ
استحصال نے ان کو غلامی اور بے چارگی کی تاریک فضا میں
بے دست و پا کر رکھا ہے''[۱۶۰]

(اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ،۱۳۰)

بہر حال جو بھی علامہ اقبال کے مطابق ہمارے سامنے آتا ہے اس سے یہی اخذ کیا جاتا ہے کہ اقبال کا فارسی شاعری کی طرف راغب ہونے کے پیچھے ایک ذہنی تحریک کا نتیجہ تھا۔علامہ اقبال کو فارسی شاعری پر قلم زنی کرنے پر ایک وسیع مقصد اور مفہوم تھا۔فارسی شاعری کے ذریعے وہ معنی پیش کیے ہے جن کو ان سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔اس کی شاعری نے قاری کے ذہن کو خبر دار کیا ہے۔اور اس سے پہلے ایک نئے عالم فکر و فلسفہ کی سیر کرائی۔تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز مثنوی سے کیا مگر بعد ازآں نہ صرف مروجہ اصناف سخن (غزل،رباعی،قصیدہ،ترکیب بند،مخمس وغیرہ) میں طبع آزمائی کی ، بلکہ ان اصناف سے ہٹ کر ہیت کے نئے تجربے بھی کئے جو کامیاب بھی رہے، ڈاکٹر محمد اقبال نے اپنے اصناف اختراع کیے جن میں جمالیاتی مکالمہ موجود ہے۔جن کو علامہ اقبال نے ''محاورہ'' کا نام دیا ہے۔مثلاً اگر اس کے پیام مشرق کو دیکھا جائے تو اس میں موجود محاورہ مابین خدا وانسان ہے۔اسی قالبہ میں اقبال کی منظومات تسخیر فطرت اور صحبت رفتگان بھی ہیں۔اور بھی مسلسل انداز علامہ اقبال کے جاوید نامہ میں بھی نظر آتا ہے۔اگر پیام مشرق کی بات کی جائے تو اس میں شاعر کے غزلوں میں مطلع یا مقطع کا فقدان ،تعداد اشعار سے بے نیازی اس کے روئے کی نمایاں خصوصیت ہے۔اس کے علاوہ پیام مشرق اور ارمغان حجاز کی رباعیاں جو کچھ تذکرہ نگار دو بیتی کہتے ہیں۔کیونکہ وہ رباعیاں علامہ اقبال نے ۲۴ اوزان سے ہٹ کر لکھے ہیں علامہ اقبال نے ان رباعیات کو باباطاہر عریاں کے سبک میں لکھا۔اصل میں یہ علامہ اقبال کا ایک خاص انداز تھا۔اور بھی اصناف کو شاعر نے موجودہ روش سے ہٹ کر قلم بند کیا۔شعروادب میں انہوں نے کئی انداز اپنائے ہیں۔ہمیشہ دوسروں سے انوکھا رہنا ان کے طبعیت میں موجود تھا۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان کے احترامی طبعیت پر اس طرح روشنی ڈالی۔

''اقبال کے ہاں اصناف کو اصولی اہمیت حاصل نہیں۔ان کے ہاں صورت تحریک وتشکیل تجربے کی تابع ہے۔اسی وجہ سے مروجہ اصناف تو ان کے ہاں موجود ہیں۔مگر انہوں نے

ان کی قدیم حد بندیوں کا لحاظ کم رکھا ہے۔میرا یہ خیال ہے
کہ اقبال کے ہاں اصناف کی حیثیت سے کوئی مقام
نہیں۔ان کے ہاں اصل شئے پیرانہ بیان اوراسلوب اظہار
ہے۔"[۱۶۱]

(اقبال کا ادبی فن،ص ۶۱)

بہرحال علامہ اقبال کے نمایاں امتیاز کواس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔کہ حکیم الامت نہ صرف شاعر تھے بلکہ مفکر بھی تھے۔انہوں نے افکار عالیہ کو اپنی شاعری میں اس معیار سے بیان کیا ہے کہ دوسری مثال ملنا مشکل و دشوار ہوگی۔اس کے کلام میں ذکر وفکر کے ساتھ ساتھ خبر و نظر کا درس ملتا ہے۔علامہ اقبال نے اپنا فلسفہ حیات تشکیل دیا جس کی اساس فلسفہ خودی وبیخودی ہے۔انہوں نے شاعری کو کبھی بھی لذات کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ فن شاعری کو ہمیشہ مخصوص مقصدیت ومعیاز ندگی کے لیے استعمال کیا۔اس کے کلام میں وسیع تاثرات موجود ہے اسی باعث اخلاص،سوز وگداز اور درد وغمخواری سے ان کی شاعری معمور ہے۔اگر علامہ اقبال کے تصوف کا ذکر کریں تو اس میں تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہیں۔عشق رسول ﷺ ان کی فکری اساس میں شامل ہے جس کا اظہار انہوں نے خوب کیا ہے۔یہی وہ معیاری اوصاف ہے جن کو نے علامہ اقبال کو نہ صرف اپنے معاصرین میں نامور کیا بلکہ پورے مشرقی ادبیات میں منفرد مقام عطا کیا ہے۔حتیٰ کہ آج بھی شاعر مشرق کو اسی مناسبت سے دیکھا جاتا ہے۔ہاں اگرچہ علامہ اقبال نے فن کے رموز سیکھنے کے لیے کسی کو باقاعدہ استاد نہیں بنایا تاہم یہ بات بھی نہیں کہ اس نے اکتساب فن نہ کیا ہو۔علامہ اقبال نے سبک ہندی کے ساتھ ساتھ سبک عراقی وخراسانی کے اہم شعراء کے کلام کا جائز مطالعہ کیا۔جن میں حافظ،رومی،عطار،عراقی،محمود شبستری اور جامی کے اسمائے عالیہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔

بلاشبہ علامہ اقبال کی شعری شخصیت اس قدر رہم پہلو ہے کہ اس کے بیان کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ان میں سے ہرایک پہلو پر الگ الگ کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔یہاں ہم بے جا طوالت سے بچنے کی خاطر اس کی رباعی گوئی کی طرف رجوع کرنے کی کوشش

کریں گئیں۔اورآئیندہ سطور میں علامہ اقبال کی رباعی گوئی کا ایک جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی جائیں۔تاکہ جواوصاف ان کے رباعیات میں موجود ہے وہ قارئین کے سامنے آئیں۔

جہاں تک علامہ اقبال کی رباعی گوئی کا سوال ہےتوان کی شاعری کا یہ گوشہ دوسرے کلام سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔اس کی رباعی دوسرے اصناف کی طرح ترکیبی نظرآتی ہے۔ان کی رباعیات میں وہ سارے موضوعات موجود ہے جو اس کی مجموعی شاعری کا خاصہ روح جان ہے۔علامہ اقبال کی رباعیات کا اہم موضوع تصوف رہا ہے۔رباعیوں کی ایک بڑی تعداد تصوف کے مضامین کی حامل ہے۔

نہ ہرکس ازمحبت سرمایہ داراست	نہ باہرکس محبت سازگاراست
برویدلالہ باداغ جگرتاب	دل لعل بدخشاں بی شراراست
نوای عشق راسازاست آدم	کشایدرازوخودرازاست آدم
جہاں اوآفریداین خوب ترساخت	مگربا ایزد انباراست آدم

ان کا بابِ رباعیات تصوف کے اعتبار سے رنگین نظرآتا ہے۔مزید یہ کہ یہاں تصوف کی عملی شکل سامنے آتی ہے علامہ اقبال کی رباعیات کا جائزہ لیتے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔کہ رباعیات میں شاعر کی چسیت ساحل سے موجوں کا تماشہ کرنے والے کی نہیں بلکہ طوفان سے لبریز پیکارشناورکی ہے۔یہ عیاں ہے کہ اقبال کی شاعری کا زیادہ توجہ خودی کی طرف رہا ہے یہی پہلوشاعرموصوف نے رباعیات میں بیان کیا ہے۔

ہنوزاندرجہان آدم غلام است	نظامش خام وکارش ناتمام است
غلام فقر آن گیتی پناہم	کہ دردرینش ملوکیت حرام است

عشق رسول: اقبال کی رباعیات میں عشق رسول کا رنگ تابناک ہے۔جس طرح نبی اکرمؐ سے عشق کا اظہاران کی مثنوعیات اورغزلیات میں ملتا ہے،اسی انداز میں رباعیات بھی عشقِ رسولؐ سے رنگین نظرآتے ہیں۔ویسےتواس کے اشعار میں رسول اکرم سے محبت وعقیدت کا بالواسطہ اظہا ہرجگہ موجود ہے۔لیکن متعدد رباعیاں میں عشق رسول نے براہ راست جلوہ نمائی کی ہے۔علامہ اقبال کا یہ عشق انتہائی جذباتیت پرمبنی ہے۔چونکہ عشق ومحبت کا تعلق جذبات

سے ہی ہوتا ہے۔اسی لیے علامہ اقبال بھی سعدی شیرازی کے اس قول کا طابع دار ہے۔

''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''

اس سے بڑھ کر بھی رسول اکرم کی ذات بابرکات کو اس دنیا میں مظہر خداوندی قرار دیا ہے۔

با خدا در پردہ گویم آشکار با تو گویم آشکار　　یا رسول اللہ او پنہان و تو پیداری من

علاوہ اقبال کہتے ہیں کہ عشق رسول نے میرے دل میں تمام دوستوں کو در بدر کیا ہے۔

تب و تاب بتکدہ عجم نرسد بسوز و گداز من　　کہ بیک نگاہ محمد عربی گرفت حجاز من

بہر دہلیز تو از ہندوستان آوردہ ام　　سجدہ شوقی کہ خون گردید در سیمائی من

اس علاوہ علامہ اقبال نے رباعیات کے ذریعے خودی کا درس دیا ہے۔مقام انسان کے لیے خودی سے ملتا جلتا موضوع کلام اقبال میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ یہ موضوع علامہ اقبال کے رباعیات میں منفرد مقام رکھتا ہے۔شاعر مشرق کے مطابق دنیا میں آدمی دیگر بے شمار مخلوقات کی طرح ایک مجبور جاندار ہی نہیں ہے بلکہ اس کی تخلیق کے پس پشت ایک عظیم مقصد درکار ہے۔تمام مخلوقات میں سے صرف انسان کو ہی ذات خداوندی نے اپنی متعدد صفات عطا کر کے دنیا میں بھیجا ہے۔انسان عشق الٰہی کا مظہر ہے اور اس کائینات کی تخلیق کا موجب ہے۔

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد　　این مشت غباری را انجم بسجود آمد

آں را ز کہ پوشیدہ در سینہ شیی بود　　از شوخی آب و گل در گفت دشنود آمد

☆☆☆

بتاں تازہ تراشیدۂ دریغ از تو　　درون خویش نہ کاویدۂ دریغ از تو

طواف کعبہ زدی گرد دیر گردیدی　　نگہ بخویش نہ پیچیدۂ دریغ از تو۔۱۶۲

(اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ۲۰۰)

حکیم الامت علامہ اقبال کے مطابق جو انسان اپنی قدر کریں وہی خداوند کریم کی ذات کو پہچان سکتا ہے۔عظمت انسان اور مقام انسان کے بارے میں علامہ اقبال کی یہ رباعی پیش کرتا ہوں۔

جا بہ آدمی نہ رسیدی خدا چہ میجوئی　　ز خود گریختہ ای آشنا چہ میجوئی

دگر بشاخ گل آویز و آب ونم درش   پریدہ رنگ زبادصبا چہ میجوئی۔۱۶۳؎

(اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ،ص،۲۰۹)

علامہ اقبال کی نظر میں خودی کی انفرادیت کا تحفظ اتنا ہے کہ انسانی خودی، خودی مطلق یعنی ذات خداوندی میں بھی ضم نہیں کرتی ہے۔وہ تمام صوفیہ کی طرح ذات باریٰ تعالیٰ کو سمندر اور انسان کو قطرے سے تشبیہ دیتے ہیں۔شاعر مشرق پرور دگار کی عظمت اور کریمی کو رباعی میں اس طرح بیان کرتا ہے۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم   سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار وراغ آیدی   خیابان وگلزار وباغ آفریدم۱۶۴؎

(تذکرہ شعرائے پنجاب،ص،۵۶)

اقبال کی نظر میں انسانی خودی کی انفرادیت اور خود پرستی کا یہ عالم ہے کہ ذات خداوندی کی حقیقت سمجھنے کے لیے پہلے خود اپنی ذات کو جانا ضروری ہے کیونکہ کہ خدا کے جلوئے کا مشاہرہ انفرادی خودی ہی کے ذریعے ممکن ہے۔مثلاً اس شعر میں علامہ نے بیان کیا ہے۔

غلام ہمت آن خود پرستم   کہ با نورِ خودی بیند خدارا

علامہ اقبال کی نظر میں خودی کی انفرادیت کا تحفظ اتنا اہم ہے کہ انسانی خودی، خودی مطلق یعنی ذات خداوندی میں بھی ختم نہیں ہوئی۔بلکہ اپنے مستقل وجود کی حفاظت کرتی ہے۔وہ تمام صوفیہ کی طرح ذات باری تعالیٰ کو سمندر اور انسان کو قطرے سے تشبیہ دیتے ہیں۔مثلاً

خودی را ازوجود حق وجودے   خودی را ازنمودِ حق نمودے

نمیدانم کہ این تابندہ گوہر   کجا بودے اگر دریا نبودے۱۶۵؎

(اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ،۲۰۸)

شاعر مشرق کا کہنا ہے کہ خودی محض اپنے وجود کا تحفظ نہیں کرتی بلکہ اس کے اظہار اور نشو دنما کے لیے بھی بیقرار رہتی ہے۔ذوق حیات کا تقاضا ہے کہ خودی تخلیق ارتقاء کی لذت سے آشنا ہو۔ہر کلی شاخ سے پھوٹنے کے لیے بیتاب ہے تا کہ وہ چمن زار زندگی میں اپنی ہستی کا ثبوت فراہم کر سکے۔

چہ لذت یارب اندر هست و بوداست دلِ هر ذره در جوشِ نموداست
شگافہ شاخ را چون غنچہ گل تبسم ایز از ذوقِ وجوداست
ترا یک نکتہ سربستہ گویم اگر درسِ حیات ازمن بگیری
بهیری گر بہ تن جانی نداری دگر جانی بہ تن داری نہ میری۔۱۶۶؎
(انتخاب ازادبیات فارسی،ص،۴۸،۱۴۷)

فارسی شاعری کے متصوفانہ موضوعات میں سے اقبال کے ہاں سب سے زیادہ کثرت سے نظر آنے والا موضوع عشق ہے۔اصل میں علامہ اقبال خدا کے ان پاک اور مقدس بندوں میں سے ہے۔جنہوں نے اس کی یاد میں اپنے آپ کو فنا کر دیا ہے۔انہوں نے ہر نفس خدا کی اطاعت اور ہر لمحہ خدا کی عبادت کے لیے وقف کیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کو رباعیات میں عشق حقیقی کا پرتو جلوہ گر ہے۔ان کی چند عشقہ رباعیاں ملاحظہ فرمائیں۔

نوا عشق را ساز است آدم کشاید را زوخود رازاست آدم
جہاں اوآفریداین خوب تراست مگر با ایزد انباز است آدم

☆☆☆

کسے کو درد پنہانے ندارد تنے دارد ولے جانے ندارد
اگر جانے ہوس داری طلب کن تب وتابے کہ پایانے ندارد

اقبال کے مطابق عشق خدا اور انسان کے باہمی رشتہ کا نام ہے اور انسان کے لیے معرفت الہیٰ کا ایک وسیلہ جو صرف انسان ہی کو دسترس میں ہے۔فرشتے تک اس سے محروم ہیں۔مثلاً اس رباعی میں بیان کرتے ہیں۔

عشق اندر جستجو افتادو آدم حاصل است جلوه اوآشکاراز پرده آب وگل است
آفتاب وماه وانجم می توان دادن زدست در بہای آن کف خاکی کہ دارای دل است

☆☆☆

بیا اے کشتِ ما اے حاصل ما بیا اے عشق اے رمزِ دل ما
کہن گشتند این خاکی نہادن دگر آدم بنا کن ازگل ما۔۱۶۷؎

(اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ۲۴۵)

دانائے راز علامہ اقبال نے مذہبی رباعیاں بھی کہی ہیں۔ان کا خیال ہے کہ عشق کے بغیر مذہب کی تکمیل نہیں ہوسکتی اور سوز وساز اس کی روح رواں ہے۔ایک مذہبی رباعی نہایت صراحت کے ساتھ بیان کی تھی۔

ز رازی حکمت قرآن بیاموز چراغے از چراغِ او برافروز
وے این نکتہ را ازمن فرا گیر کہ نتوان زیستن بے مستی وسوز

علامہ اقبال نے اپنے رباعیوں میں پروردگار سے دعائیں بھی کہیں ہیں۔وہ دل کو یقین سے بسانے کے لیے درگاہِ خداوندی میں یوں دعا کرتا ہے۔

این دل کہ مرادادی لبریز یقین بادا این جامِ جہان بینم روشن تر ازین بادا
تلفے کہ فرد ریذ دگردون بہ سقال من درکامِ کہن رندے آنہم شکرین بادا۔۱۶۸

(فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ۲۴۷)

شاعر مشرق کے یہاں کچھ خمریہ رباعیاں بھی نظر آتی ہیں۔یہ رباعیاں مولانا رومؔی کے خمریہ سے مختلف ہیں۔عشق حقیقی کا مئے اقبال نے ہمیشہ پینا چاہا۔وہ عمر خیام کی طرح مئے معرفت نہیں پیتے ہیں کہ بہک جائیں ان کی رباعیات میں ایک ہلکا سا سرور پایا جاتا ہے۔

تہی از ہائے وہو میخانے بودے گل ماز شرر بیگانہ بودے
نبودے عشق ق این ہنگامہ عشق اگر دل چون خرد فرزانہ بودے۔۱۶۹

(ارمغان حجاز،ص۲۳۳)

علامہ اقبال کے ذاتی رباعیوں کا ایک اور پہلو اہم وقابل ذکر ہے کہ اقبال کو دیگر معزز حضرات کے ساتھ کیسے تعلقات تھے۔علامہ اقبال نے بابا طاہر عریاں کی پیروی میں کہی رباعیاں لکھی ہیں۔ان رباعیوں کو وزن اور رموز اوزان کو فصیح اور شرین فارسی میں سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔دونوں کی رباعیات میں ایک اہم فرق یہ ہے کہ بابا طاہر عریاں کا کلام سراپا جذبہ ہے لیکن علامہ اقبال کے کلام میں جذبے کے ساتھ فکر عمیق کی ہم آہنگی بھی ہے۔بابا طاہر عریاں کے ہاں خود سپردگی، جذبہ ومستی اور سوز وآشفتگی کی ایک مستقل کیفیت ہے اقبال کی

زندگی سراپا عشق ہے۔ دل کے موضوع پر ایک ایک رباعی دونوں شاعروں کی پیش کرنے کی سعادت کرتا ہوں۔

باباطاہرعریاں:

مگر شیر و پلنگی اے دل اے دل   بمودایم مجنگی اے دل اے دل

اگر بستم رسی خونت بریجم   بونیم تا چہ رنگی اے دل اے دل

علامہ اقبال:

بہ کوشش رہ سپاری اے دل اے دل   مرا تنہا گزاری اے دل اے دل

دما دم آرزوہا آفرینی   مگر کارے نداری اے دل اے دل۔۷۰ا؎

(اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص، ۴۴۶)

باباطاہرعریاں کی طرح رومؔی اور اقبال کے ضمن میں ایک اہم حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جہاں رومؔی کی شخصیت نے اقبال کو فکری اور روحانی تربیت میں درخشاں کردار ادا کیا ہے وہاں جدید دور میں خود رومؔی کے افکار کی تفسیر اور ان کی صحیح اہمیت کا تعارف اقبال سے ہوا ہے۔ یہ نہیں کہ فکر و شعر اور عرفان و تصوف کی دنیا رومؔی کی عظمت سے غافل تھی۔ رومؔی کی مثنوی کو پندرھویں صدی میں جامؔی نے 'ہفت قرآن در زبان پہلوی'' کہہ کر اس کی معنوی اور روحانی عظمت کو تسلیم کیا تھا۔ اس مثنوی کو ہمیشہ عرفان و تصوف کا پیکر اں سمجھا گیا اور اس کی جامع شرحیں لکھیں گئیں۔ مگر دور جدید مغربی فلسفے کے پس منظر میں رومؔی کی فکر کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر اقبال نے جس طرح روشنی ڈالی ہے اس نے رومؔی کے کلام میں نئے ابعاد کا اضافہ کیا ہے۔ مندرجہ ذیل رباعی میں رومؔی کے شیوہ رقص کی بیتاب تمنا کا اظہار ہوتا ہے۔

رومؔی: بیا با ہم درآویزیم و رقصیم   زگیتی دل بر انگیزیم و رقصیم

یکے اندر حریم کوچہ دوست   زچشمان اشک خون ریزیم و رقصیم

اقبال: ازچشم ساقی مستِ شرابم   بے مے خرابم بے مے خرابم

شوقم فزون تر از بے حجابی   بینم نہ بینم در پیچ و تابم

اقبال قوت کا شاعر ہے اور قوت سے مراد صرف مادی قوت نہیں ہے بلکہ روحانی قوت اور اخلاقی بھی ہے۔ ایک دلکش رباعی میں جسمانی طاعت اور عشق واخلاق کی لطیف قوت کا امتزاج پیدا کرنے کی دعوت دی ہے۔ نہ جسم و روح کی اس ہم آہنگی ہی سے انسان کی شخصیت عظمت کی معراج کو چھوتی ہے۔

تنے پیدا کن از مشت غبارے　　　　تنے محکم تر از سنگین حصارے

درونِ او دل دردآشنائے　　　　چو جوئے در کنارِ کوہسارے۔ ۱۷۱

(اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ،)

علامہ اقبال کی رباعیوں میں جہاں سوز وساز کے ساتھ نیازمندی کا اظہار ہوتا ہے وہاں شاعر نے حضور خداوندی میں بہت شوخیاں بھی کی ہیں اور راہ ورسم عاشقانہ اور ناز و نیاز کے نازک رشتوں کے بل پر اپنے گلے شکوئے میں غیر معمولی آزادی برق ہے۔ علامہ کی زندگی ملت کے حضور میں تڑپنے میں گزری۔ البتہ اس نے ایک نوائے دل گداز ضرور پیدا کی۔

حضورِ ملت بیضا تپیدم　　　　نوائے دل گدازے آفریدم

ادب گوید سخن را مختصر گوئے　　　　تپیدم آفریدم آرمیدم

☆☆☆

کہ گفت او را کہ آید بوئے یارے　　　　کہ داد او را امید بہارے

چون آں سوز کہن رفت از دمِ او　　　　کہ زد بربستانِ او شرارے

☆☆☆

کرپال سنگھ بیدار

۱۹۶۵ء میں پنجاب سرکار کی طرف سے شاعرِ اعظم کا خطاب پانے والا خوش پوش، چمپئی رنگ، نیک فطرت نوجوان شاعر کا نام کرپال سنگھ تھا اور تخلص بیدؔار استعمال کرتے تھے۔ انُ کے والد برزگ کا نام خوش حال سنگھ تھا۔ جو نیک طبیعت، سخی دل اور رئیس تھے۔ کرپال سنگھ بیدؔار کا تعلق جاٹ سکھ خاندان سے تھا۔ تحصیل ننکانہ (پاکستان) کے ایک گاؤں کنھگراں والا میں پیدا ہوئے۔ بیدؔار کی تاریخ ولادت کے بارے میں مستند معلومات نہیں ہیں۔ البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر موصوف ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء تک زندہ تھے۔ اگرچہ بیدؔار کے آبا واجداد زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن کرپال سنگھ نے تاریکی کو روشنی میں تبدیل کردیا۔ ایامِ طفولیت سے ہی تعلم و تربیت کا شوق تھا۔ تاریخ کے مطابق مڈل اسکول میں نند کشور رجگر سے کسب وفیض حاصل کیا تھا۔ میلا رام وؔفا کے شاگرد بھی رہے۔ جوؔش ملیسانی کو بھی اپنا کلام دیکھاتے تھے۔ لیکن بیدؔار نے علامہ نجیب تاجوؔر کو اپنا باقاعدہ استاد مقرر کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر متفق تھے۔ کرپال سنگھ بیدؔار کو جتنا فخر علامہ تاجوؔر کے شاگرد ہونے پر ہے اتنا ہی فخر علامہ تاجوؔر کو بیدؔار کا استاد ہونے پر تھا۔ وہ اکثر و بیشتر ''موقر ماہنامہ'' میں بیدؔار کی تعریف کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انھوں نے اپنے شاگرد کو علامہ اقبال کے ہم پلہ ٹھہرایا ہے۔ یہ اعتراف کرتے تھے کہ اقبؔال کے کلام میں اگرچہ کمیاں نظر آتی ہیں لیکن میرے شاگرد کا کلام ان کمیوں سے پاک ہے۔ میلا رام وؔفا نے تاجوؔر کے بیاں کو یوں قلم بند کیا ہے۔

> ''علامہ تاجوؔر جب کبھی اپنے موقر ماہنامہ میں بیدؔار کا کلام شائع کرتے تو اس پر اچھے انداز میں تعریف کرتے تھے۔ انھوں نے ذمہ داری سے یوں بھی کہا ہے کہ بیدار اقبؔال کا ہم پلہ شاعر ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اقبؔال کے کلام میں کہیں کہیں کمیاں پائی جاتی ہیں۔ وہ بیدؔار کے کلام میں نظر نہیں آتیں۔''[۲۷]

(کلیات بیدار، ص۱۰)

زمانہ طالب علمی سے ہی بیدآر کو شعروادب سے رغبت تھی۔شروع سے ہی ان کو کئی انعامات سے نوازا گیا۔میلا رام وفآ کے مطابق ایک مشاعرے میں بیدآر نے غزل پڑی اس کا ایک شعرا تنا مشہور ہوا کہ شعر نے محفل کے سرپرتوں کو بھی حیران کر دیا۔اس وقت شاعر کی عمر صرف سترہ سال تھی۔شعر نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

خیال مرگ سے کیا کیا نہ جان پر بنتی
ہزار ذکر ہمیں زیست کا مزا نہ ملا

شروع میں بیدآر نے زیادہ اردو مشاعروں میں حصہ لیا تھا۔لیکن فارسی کے ساتھ خاص رغبت تھی۔ مذکورہ شعر سے دو باتیں اخذ ہوتی ہیں ایک یہ کہ شاعر کی فطرت میں علم شناسی کا جذبہ موجود تھا۔دوسرا یہ کہ شاعر موصوف کو ایام طفولیت سے ہی فارسی زبان و ادب کا شوق تھا۔بہر حال فارسی میں ایم۔اے۔درجہ اول میں پاس کرنے کے بعد ہی سکھ نیشنل کالج لاہور میں بحیثیت پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔کچھ وقت روز نامہ ''شمشیر'' میں ایڈیٹر کے طور پر وابستہ رہے۔اسی عہد میں ملک کا ماحول درہم وبرہم ہو گیا جس کا اثر ان کے کلام پر بھی پڑا۔کچھ حد تک شاعر موصوف نے بھی حکومت کے خلاف اپنا کلام شائع کر دیا۔زمانہ طالب علمی سے ہی بیدار تند اور ہونہار تھے۔اگر چہ انہوں نے افراتفری کے ماحول میں پرورش پائی لیکن قدرت کی طرف سے ان کو امتیاز حاصل ہوا۔جیسا کہ بیدار کو جید الفطرت اور عظیم شاعر پیدا کر کے قدرت نے اپنے بخل کی تلافی کی ہے۔شاعر کو ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ ان کو علامہ نجیب تاجوؔر جیسا استاد نصیب ہوا۔جنہوں نے بیدآر کو وقت وقت پر حوصلہ افزائی کی۔وہ بیدآر کو اقبآل ثانی کہہ کر پکارتے تھے۔میلا رام وفآ بیدآر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔

''پنجاب کے اکثر مشاعروں میں بطور صدر مولانا تاجوؔر ہی
ہوا کرتے تھے۔سچ جانتے قابل استاد نے بیدآر کو اقبآل کے
برابر کھڑا کر دیا'' ۳۷ا (کلیات بیدار،ص ۱۵)

اپنے عہد کے تمام شعراء میں صرف بیدآر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کا کلام تمام لغزشوں سے پاک ہے۔بیدآر نے غزل،نظم کے علاوہ رباعیات پر بھی قلم زنی کی ہے انہوں

فارسی رباعیات کے ذریعے دل کی اہمیت وافادیت کو بیان کیا ہے۔ بیدآر کے مطابق دل جسم کا حصہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی وسعت بہت گہری ہوتی ہے دل سے ہی انسان پروردگار علم تک رسائی حاصل کرسکتا ہے۔شاعر کے مطابق عاشق خدا دنیا کا کوئی غم نہیں ہوتا۔اگر چہ وہ کتنا بھی مصیبت میں پڑھے کبھی بھی وہ خوصلہ شکن نہیں ہوتا۔نمونہ کے طور پر شاعر کی چند رباعیاں پیش کرنے کی سعادت کرتا ہوں:۔

دل عاشق غم دنیا ندارد　　خیالِ پیش وکم اَصلا ندارد
حذر ازصحبت آں خامکارے　　کہ سردارد ولےسودا ندارد

☆☆☆

دل شیدا کہ مارا کناراست　　ہزار آشوب را پروردگار است
ہمی راندسفینہ اندر آں بحر　　کہ از موجش قیامت آشکاراست

☆☆☆

چو دور از شورش دوراں نشینم　　بےدل تازہ و شاداں نشینم
خیالم آنچناں محو تو گردد　　کہ فارغ ازغم ہجراں نشینم

شاعر نے خدا کی وحدانیت کا یوں اعتراف کیا ہے۔

در افلاک یکسر بازکردم　　جہاں را آشنائے رازکردم
بخاک خویش بخشیدم پرشوق　　زمین را آسمان پروازکردم۔۴۷

(کلیات بیدار،ص ۵۱۷)

بیدآر کا شمار اردو و فارسی ادب کے ان مایہ ناز ہستیوں میں کیا جاتا ہے۔جن کے ادبی کارنامے اہمیت کے حامل ہیں۔ بیدآر کے شعری آثار مکمل طور پر جلوہ گر نظر آتے ہیں۔شاعر کو فارسی زبان پر مکمل اشنائی حاصل تھی۔آپ فارسی میں فصیح البیانی اور جدت طرازی کی وجہ داد سخن لیتے تھے۔ بیدآر کے کلام پر سعدیؔ شیرازی،حافظ شیرازی کا اثر نمایاں ہے۔سعدی کی طرح انہوں نے بھی چھوٹی چھوٹی بحروں کا استعمال کیا ہے۔ان کی طرز پر حسب ذیل رباعی ملاحظہ فرمائیں۔

مرا از خواجہ ایں قول یاداست　　　کہ شاہی باعدالت خیرو داداست
عدالت را اگر شامل نداری　　　ہمیں سرمایہ شر وفساداست
من از افرنگیان حکمت خردم　　　بہ نقدِ روشنی ظلمت خریدم
ببیں اے دوست ایں وا دوست را　　　کہ راحت دادم و کلف خریدم۔ ۱۷۵؎
(کلیات بیدار، ص ۵۱۶)

شاعر نے اپنے کلام میں دنیا کی بے ثباتی کو بیان کیا ہے ان کے مطابق یہ دنیا دھوکہ اور فریب کے سوا کچھ نہیں ہے بیدآر اپنے عہد کی بے حیائی اور ریاکاری کو دیکھ کر دنیا سے بہت ناراض رہے۔ ہمیشہ انہوں نے اتحاد و اتفاق پر درس دیا ہے۔ علم حاصل کرنے پر ہمیشہ زور دیتے تھے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان خالی ہاتھ بیٹھے کچھ نہیں کرسکتا ہے انسان کو چاہیے کہ وہ شناسائی حاصل کریں۔ مثال کے طور پر یہ رباعیاں پیش کرتا ہوں:۔

مرا ایں عصر حاضر ناپسنداست　　　کہ نیکاں را ازو دل دردمنداست
نگوں سر می نشیند مردِ حق کیش　　　ولے باطلِ پرستے سربلنداست

☆☆☆

تو از خالی صدف گوہر چہ خواہی　　　تپ شعلہ ز خاکستر چہ خواہی
بجز آں دل کہ سردو بے فروغ است　　　ز علم مکتبی دیگر چہ خواہی۔ ۱۷۶؎
(کلیات بیدار، ص ۵۲۶)

بیدآر کم گو ہیں لیکن اپنے کلام کو ہر پہلو میں قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے استاد کی نصیحتوں پر پورے اترتے ہیں۔ بیدآر علامہ تاجوؔر کے قول کو وقت وقت پر یاد رکھتے کہ شعر کا ہر لفظ تار رباب کی طرح بجتا ہوا نظر آنا چاہیئے۔ بیدآر کو ہر شعر کا مرتبہ معلوم ہے وہ استہزابی ریمارکس کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھتے۔ شاعر اپنے فن کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح نبانے کی کوشش کرتے ہے۔ اخباروں اور رسالوں میں چھپنے کے لیے بے تابی کا اظہار نہیں کرتے۔ ۱۱ مارچ ۱۹۶۵ء کو پنجاب سرکار نے شاعر کو شاعرِ اعظم کا خطاب سے ساتھ سپاس نامہ، خلعت فاخرہ اور دیگر انعامات سے نوازا ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں بیدآر پنجابی یونیورسٹی شعبہ

فارسی اردو اور عربک کے صدر مقرر ہوئے۔

بیدآر کا فارسی کلام ذہنی اور روحانی کشمکش کا عکاس ہے۔ان کا شمار ایسے شاعروں میں کیا جا سکتا ہے جن کی زبان سے نکلے ہوئے ہر شعر کی قسمت ابدیت نظر آتی ہے۔انھوں نے کبھی انقلابی ہونے کا تو دعوا نہیں کیا لیکن ان کا ادراک جمالیات نہایت بلند درجے کا ہے۔ان کا عشق خالص انسانی عشق ہے۔ان کا تصور حسن و عشق بہت ارفع ہے۔طہارت خیال اور اظہار جذبات میں ہمیشہ خلوص سے کام لیتے ہیں۔اسرار حیات کو فاش کر کے پیکار حیات کو آسان ہی نہیں بلکہ دلکش بنا دیتے ہیں۔

دیار آسماں را دیدہ ام من دراں وادی بسے گردیدہ ام من
چہ می پرسی ز مہر و ماہ و انجم ہمہ را دانہ دانہ چیدہ ام من

☆☆☆

توای آقائے بحر و بر کہ افرنگ توای دارائے خشک و تر کہ افرنگ
بفرما آخر اے رب السموات توای آقائے را دارو کہ افرنگ

☆☆☆

شاعر کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو ایک قیمتی سرمایہ عقل کی صورت میں فراہم کیا ہے انسان کو چاہئے کہ عقل سے کام لیں۔عقل فلسفہ سے بھی باری ہے۔اور وہم و وسوسہ سے بہت قریب ہے۔ایک رباعی نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل ہے:۔

خرد از فلسفہ باریک تر شد بہ وہم و وسوسہ نزدیک تر شد
ز علم غربیاں فریاد فریاد کہ دل تاریک و جاں تاریک تر شد

☆☆☆

شاعر اس دنیا کو اپنے لیے میخانہ قرار دیتا ہے۔اس رباعی میں واضع کیا۔

زمین و آسمان میخانہ ای ماست مکان و لامکان مستانہ ای ماست
جبینِ مہر و مہ تابندہ گردد ازاں صہبا کہ در پیمانہ ای ماست۔۱۷۷

(کلیات بیدار، ص ۵۱۵)

بہر حال جتنا بیدآر پر لکھا جائے اتنا ہی کم ہے یہاں آخر میں کچھ اہم شخصیتوں کی رائے کو پیش کرنے کی کوشش کروں جو انہوں نے شاعر موصوف کے معیار و عظمت کلام کے بارے میں بیان کی ہے۔ پہلے میں شاعر کے استاد مولانا نجیب تاجوؔر کی رائے کو قلم بند کروں جو انہوں نے بیدآر کے بارے میں کئی ہے۔

''اس ذہین اور اور فہیم نوجوان نے ایک ایسے وحشت کدہ دور میں پرورش پائی جس سے تہذیب و تمدن کی ہمہ رس برکات بارہ بارہ کوس تک محسوس کی جا سکتی ہے۔ مگر بیدآر جیسا جید الفطرت اور عظیم شاعر وہاں پیدا کر کے قدرت نے اپنے بخل کی تلافی کی ہے۔''

(علامہ تاجور نجیب آبادی)

پروفیسر راجندر سوؔز نے بیدآر کے علمی قوت کو یوں بیان کیا ہے۔

''بیدآر کے انداز میں خودداری اور عجیب انفرادیت تھی۔ وہ نہایت متین اور متوازن انداز میں باتیں کرتے تھے۔ ان کا آفتابی چہرہ، پر کیف آنکھوں سے مردانہ حسن ظاہر ہو رہا تھا۔''

اودے سنگھ شائق فرید کوٹی نے بیدآر کے بارے یوں بیان کیا ہے۔

''بیدآر کم وقت میں بہت آگئے نکل گئے''

جگر مراد آبادی نے کرپال سنگھ بیدآر کے شاعرانہ عظمت کو اس طرح رقم طراز کیا ہے۔

''بیدآر کو لائل پور کا مشاعرے میں سنا اور میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ اس نوجوان کی بنا پر یو پی والوں کو مشاعرے کے میدان میں آگئے بڑھنے سے روک دیا''

بہر حال کلام بیدار کو دیکھ کر یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تخیل کی مدت، تراکیب کی جرائت ، الفاظ کا شکوہ اور نظم محاسن سے ان کی شاعری بھرپور ہے۔ شاعرؔ نے مشرقی پنجاب میں آنے کے بعد فارسی شاعری کی طرف کم توجہ دی۔ اس کے باوجود بھی تذکرہ نگاروں کے مطابق ان کا فارسی

کلام اردو کلام سے بہت زیادہ دل آویز اور اثر انگیز ہے۔ بہر حال بیدآر کے کلام کو دیکھ کر یہ محاکمہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے کلام میں وہ سارے صفات موجود ہے جو اعلیٰ پایہ کے شاعر کے لیے ہونے چاہئے۔ بیدار کا کلام تاریخی بصیرت سے خالی نہیں۔ ان کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو اس دور کے بعض تاریخی، سماجی و سیاسی واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں مثلاً ایسے اشعار جو انہوں نے اپنے زمانے کے شاعروں، امیروں اور حاکمِ وقت کے متعلق کہیں ہیں۔ آخر میں بیدآر کی چند ایسی رباعیات ملاحظہ ہوں جو سیاست کے لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔

بہر نوشے ہزاراں نیش بینم   خلائق را ہمہ دل ریش بینم
عجب آئین جمہوری است یارب   کہ صد سلطاں بگر دِ خویش بینم

☆☆☆

دلم از شیوہء جمہوریش است   ہمہ تکرار باہم ہم چونیش است
عجیب است ایں کہ تقریر دوناداں   زقول عاقلے درقدر بیش است

☆☆☆

ز خبث باطنی عارے ندارند   بحق کیشی سروکارے ندارند
حذر دارم ز ارباب سیاست   کہ ہیچ از حسنِ کردارے ندارند

۱۷۸ (کلیات بیدار، ص۵۲۳)

بیدآر کا شمار ے۱۹۶ء کے زندہ دل شاعروں ہوتا ہے۔ فارسی کلام کے معیار کے لحاظ سے ان کا شمار سعدؔی، غالبؔ اور اقبالؔ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مذکورہ شاعروں کا اثر ان کے کلام پر نمایاں ہے۔ بیدآر نے بحروں اور لفظوں کے انتخاب میں رواں دواں، بحروں اور سامنے کے الفاظ کو غیر ہموار، بحروں اور فارسی نژاد الفاظ اور تراکیب پر ترجیع دی ہے۔ بیدآر کی وہ غزلیں جو چھوٹی بحر میں ہیں، سہل ممتنع کی زندہ اور دلآویز مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ شاعر نے اپنے کلام میں دوسرے عظیم شعراء کی عظمت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ مثلاً غالب کو اس طرح داد تحسین دی ہے۔

ثانی غالب مگو بیدآر را   طفلِ مکتب ہمسر اُستاد نیست

دوسری جگہ مقطع کا یوں استعمال کیا ہے۔

دگر چہ شعر سرایم کہ قافیہ تنگ است مرا روانی گفتار ختم شد بیدآر

بہر حال کرپال سنگھ بیدآر فارسی ادب کے قادر الکلام شاعر تھے۔ان کی کلیات کو ڈاکٹر محمد جمیل نے ۲۰۱۸ء میں ترتیب و تدوین دی ہے۔اس کلیات میں اردو کلام کے ساتھ فارسی کے بہت سے رباعیات موجود ہیں جن کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جتنی بیدآر کی تعریف کی جائے اتنی کم ہے۔جو ذخیرہ کلیات بیدآر میں موجود ہے اس کلام کو علمی و ادبی دنیا میں یقیناً پذیرائی ہونی چاہیے۔کیونکہ ان کا کلام ادبی حلقوں میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔

حوالہ جات

۱؎ دیوان مسعود سعد، رشید یاسمی، دانشگاہ تہران، ۱۳۱۸ھ، ص ۱۱۷

۲؎ ایضاً

۳؎ ایضاً، ص ۹۳۷

۴؎ ایضاً، ص ۱۸۷

۵؎ ایضاً، ص ۱۸

۶؎ ایضاً، ص ۲۸۰

۷؎ اردو رباعیات، سلام سندیلوی، نسیم بک ڈپو، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۴۵

۸؎ دیوان مسعود سعد، رشید یاسمی، دانشگاہ تہران، ۱۳۱۸ھ، ص ۲۰۸ (۹) ایضاً، ص ۲۰۷

۱۰؎ ایضاً، ص ۲۱۷ (۱۱) ایضاً، ص ۲۷۷

۱۲؎ خزانہ عامرہ، غلام علی آزاد بلگرامی، نولکشور پریس کانپور، ۱۸۷۱ء، ص ۱۴

۱۳؎ فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر محمد ریاض اور ڈاکٹر محمد صدیق شبلی، کاک آفیسٹ پرنٹرس دہلی، ۲۰۰۴ء،

۱۴؎ دیوان مسعود سعد، رشید یاسمی، دانشگاہ تہران، ۱۳۱۸ء، ص ۶۵۹ (۱۵) ایضاً، ص ۶۶۹ (۱۶) ایضاً، ص ۱۱۷

۱۷؎ ایضاً، ص ۲۱۷

۱۸؎ فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر ریاض احمد اور ڈاکٹر صدیق شبلی، کاک آفیسٹ پرنٹرس دہلی، ۲۰۰۴ء،

۱۹؎ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبد الرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء

۲۰؎ انجمن، ص ۲۲

۲۱؎ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبد الرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۶۲

۲۲؎ فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر محمد ریاض و ڈاکٹر صدیق شبلی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۵۴

۲۳؎ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبد الرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۶۲

۲۴؎ دیوان مسعود سعد، رشید یاسمی، دانشگاہ تہران، ۱۳۱۸ھ، ص ۵۵۰

۲۵؎ آتشکدہ آزر، لطف علی بیگ آزر، مطبوعہ کلکتہ، ۱۲۴۹ھ، ص ۲۲۷

۲۶؎ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبد الرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۱۷ء، ص ۱۶۳

۲۷؎ ایضاً، ص ۱۶۴

۲۸؎ لباب الباب، محمد عوفی، مطبوعہ لندن، ۱۳۲۱ھ، ص ۴۱۹

۲۹؎ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبد الرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۱۷ء، ص ۱۶۴

۳۰۔ ایضاً (۳۱) ریاض الشعراء، علی قلی والہ داغستانی، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ص ۷۷

۳۲۔ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبدالرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۶۴

۳۳۔ ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء، سید عابد حسن، ص، ۴۹

۳۴۔ پانی پت اور بزرگان پانی پت، مولانا محمد میاں، الجمعتہ پریس، دہلی، ۱۹۶۳ء، ص ۳۶

۳۵۔ ہفت اقلیم، امین رازی، ص ۴۶۱

۳۶۔ ماہنامہ نظامی آواز، سید محمد نظامی، ہریانہ، اکتوبر ۲۰۱۷، ص ۸

۳۷۔ دیوان بوعلی، بوعلی شاہ قلندر، خدا بخش لائبریری پٹنہ، ص ۲۷

۳۸۔ کلام قلندری، بوعلی قلندر، مطبع جٹ پرشاد، میرٹھ، ۱۸۹۰ء، ص ۱۶

۳۹۔ ایضاً

۴۰۔ ایضاً، ص ۸۹

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۴۲۔ دیوان بوعلی، شرف الدین بوعلی، خدا بخش لائبریری پٹنہ، ص ۴۲

۴۳۔ فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر ریاض وڈاکٹر صدیق شبلی، ۲۰۰۴، ص ۴۳

۴۴۔ اسرار رموز، اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۲۴

۴۵۔ خزینتہ الاصفیاء، غلام سرور لاہوری، نولکشور لکھنوء، ۱۲۸۰ھ، ص ۳۲۷

۴۶۔ کلام قلندری، بوعلی قلندر، مطبع جٹ پرشاد، میرٹھ، ص ۱۲۴

۴۷۔ ایضاً، ص ۷

۴۸۔ دیوان شمس، مولا نا رومی، ص ۱۲

۴۹۔ کلام قلندری، بوعلی قلندر، مطبع جٹ پرشاد، میرٹھ، ۱۸۹۰ء، ص ۴

۵۰۔ خزانہ عامرہ، غلام علی آزاد بلگرامی، نولکشور پریس کانپور، ۱۸۷۱ء، ص ۴۲۵

۵۱۔ چمنستان، آنند رام، نولکشور لکھنوء، ۱۸۷۷ء، ص دیباچہ

۵۲۔ پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ، ڈاکٹر ظہور الدین احمد، مجلس ترقی ادب، دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۱۷۰

۵۳۔ ادبیات فارسی میں ہندوں کا حصہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۷۰

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۵۵۔ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ڈاکٹر طارق کفایت اللہ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، ۱۹۹۳ء، ص ۲۴۰

۵۶۔ خزانہ عامرہ، غلام علی آزاد، نولکشور پریس کانپور، ۱۸۷۱ء، ص ۴۲۵

۵۷۔ ریاض الشعراء، علی قلہ داغستانی، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۰۰ء، ص ۴۲۳

۵۸۔ سفینۂ خوشگو، بندرا بن داس خوش گو، مرتبہ عطا الرحمان، پٹنہ، ۱۹۵۹ء، ص ۳۲۱

۵۹۔ خزانہ عامرہ، غلام علی آزاد بلگرامی، نولکشور پریس کانپور، ۱۸۷۱ء، ص ۴۲۵

۶۰۔ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ڈاکٹر طارق کفایت اللہ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، ۱۹۹۳ء، ص ۲۴۰

۶۱۔ سفینۂ خوشگو، بندرا بن داس خوش گو، مرتبہ عطا الرحمان، پٹنہ، ۱۹۵۹ء، ص ۳۳۷

۶۲۔ خزانہ عامرہ، غلام علی آزاد بلگرامی، نولکشور پریس کانپور، ۱۸۷۱ء، ص ۴۲۶

۶۳۔ سفینۂ خوشگو، بندرا بن داس خوش گو، مرتبہ عطا الرحمان، پٹنہ، ۱۹۵۹ء، ص ۳۳۵

۶۴۔ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ڈاکٹر طارق کفایت اللہ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، ۱۹۷۸ء، ص ۲۴۵

۶۵۔ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبدالرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۳۳۰

۶۶۔ ایضاً، ص ۳۷

۶۷۔ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ڈاکٹر طارق کفایت اللہ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، ۱۹۹۳ء، ص ۹۴

۶۸۔ نتائج الافکار، محمد قدرت اللہ، در بندر معمورہ، بمبئی، ۱۳۳۶ھ، ص ۱۰۶

۶۹۔ منشات برہمن، چندر بھان برہمن، نولکشور کانپور، ۱۸۸۵ء، ص ۱۱

۷۰۔ کلمات الشعراء، محمد افضل سرخوش، مدارس یونیورسٹی مدراس، ۱۹۵۱ء، ص ۲۱۹

۷۱۔ کلمات الشعراء، محمد افضل سرخوش، مدارس یونیورسٹی مدراس، ۱۹۵۱ء، ص ۱۶

۷۲۔ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۸۱

۷۳۔ عمل صالح، محمد صالح کنبو، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۴۳۴

۷۴۔ انشائی منیر، ص ۱۵

۷۵۔ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ڈاکٹر طارق کفایت اللہ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۸

۷۶۔ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبدالرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۵۷

۷۷۔ گل رعنا، لچھمی نرائن شفیق، حیدر آباد و خطی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

۷۸۔ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبدالرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۶۷

۷۹۔ ایضاً

۸۰۔ ایضاً، ص ۷۷

۸۱۔ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ڈاکٹر طارق کفایت اللہ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، ۱۹۹۳ء

۸۲۔ سفینۂ خوشگو، بندرا بن داس خوش گو، مرتبہ عطا الرحمان، پٹنہ، ۱۹۵۹ء، ص ۷۱-۷۲

۸۳ کلمات الشعراء، محمد افضل سرخوش، مدارس یونیورسٹی مدراس، ۱۹۵۱ء، ص ۱۶۵
۸۴ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ڈاکٹر طارق کفایت اللہ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۰۸
۸۵ سفینہ خوشگو، بندرابن داس خوش گو، مرتبہ عطاالرحمان، پٹنہ، ۱۹۵۹ء، ص ۷۱
۸۶ کلمات الشعراء، محمد افضل سرخوش، مدارس یونیورسٹی مدراس، ۱۹۵۱ء، ص ۲۸۔۲۹
۸۷ سفینہ خوشگو، بندرابن داس خوش گو، مرتبہ عطاالرحمان، پٹنہ، ۱۹۵۹ء، ص ۷۶
۸۸ ایضاً
۸۹ کلمات الشعراء، محمد افضل سرخوش، مدارس یونیورسٹی مدراس، ۱۹۵۱ء، ص ۱۰۴
۹۰ ایضاً، ص ۱۲۸
۹۱ ایضاً، ص ۹۔۴
۹۲ سفینہ خوشگو، بندرابن داس خوش گو، مرتبہ عطاالرحمان، پٹنہ، ۱۹۵۹ء، ص ۷۶
۹۳ ایضاً
۹۴ ایضاً، ص ۸۱
۹۵ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ڈاکٹر طارق کفایت اللہ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۹۲
۹۶ سفینہ خوشگو، بندرابن داس خوش گو، مرتبہ عطاالرحمان، پٹنہ، ۱۹۵۹ء، ص ۸۰
۹۷ کلمات الشعراء، محمد افضل سرخوش، مدارس یونیورسٹی مدراس، ۱۹۵۱ء، ص ۱۰۴
۹۸ سفینہ خوشگو، بندرابن داس خوش گو، مرتبہ عطاالرحمان، پٹنہ، ۱۹۵۹ء، ص ۸۱
۹۹ ایضاً، ص ۹۷
۱۰۰ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ڈاکٹر طارق کفایت اللہ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۹۸
۱۰۱ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبدالرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۹۲
۱۰۲ فارسی ادب در عہد اورنگ زیب، ڈاکٹر نورالحسن، انڈو پرشن سوسائیٹی، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۸۰
۱۰۳ دیوان ناصر علی، ناصر علی سرہندی، مطبع نظامی لکھنوء، ۱۱۴۴ھ، ص ۸۸
۱۰۴ چکیدہ تاریخ ادبیات ایران، منظر امام، بھارت آفیسٹ پرنٹرس دہلی، ۲۰۰۰ء، ۱۲۵
۱۰۵ دیوان ناصر علی، ناصر علی سرہندی، مطبع نظامی لکھنوء، ۱۱۴۴ھ، ص ۸۸
۱۰۶ بزم تیمورہ، صباح الدین عبدالرحمان، معارف اعظم گڈھ، ۱۳۶۷ھ، ص ۷۱
۱۰۷ تصحیح و تدوین دیوان ناصر علی، ناظرہ اسحٰق، شعبہ فارسی علی گڈھ، ۲۰۱۵ء، ص ۵۶
۱۰۸ ایضاً، ص ۵۷

۱۰۹۔ ایضاً

۱۱۰۔ کلمات الشعراء، محمد افضل سرخوش، مدارس یونیورسٹی مدراس، ۱۹۵۱ء، ص ۷۶

۱۱۱۔ ایضاً

۱۱۲۔ ایضاً، ص ۷۵

۱۱۳۔ سفینہ خوشگو، بندرابن داس خوش گو، مرتبہ عطا الرحمان، پٹنہ، ۱۹۵۹ء، ص ۱۶

۱۱۴۔ دیوان ناصر علی، ناصر علی سرہندی، مخطوطہ ۸۸، مطبع نظامی لکھنوء، ۱۱۴۴ھ،

۱۱۵۔ فارسی زبان وادب، ڈاکٹر سید عبداللہ، مجلس ترقی ادب لاہور، ص ۱۹۷۷ء، ص ۱۲۳

۱۱۶۔ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ڈاکٹر طارق کفایت اللہ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۳

۱۱۷۔ دیوان ناصر علی، ناصر علی سرہندی، مخطوطہ ۸۸، مطبع نظامی لکھنوء، ۱۱۴۴ھ،

۱۱۸۔ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبدالرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۹۲

۱۱۹۔ ایضاً، ص ۲۵۴

۱۲۰۔ سفینہ خوشگو، بندرابن داس خوش گو، مرتبہ عطا الرحمان، پٹنہ، ۱۹۵۹ء، ص ۲۷۳

۱۲۱۔ خزانہ عامرہ، غلام علی آزاد بلگرامی، نولکشور پریس کانپور، ۱۸۷۱ء، ص ۳۳۰

۱۲۲۔ نسخہ دیوان ناصر علی، ناصر علی سرہندی، مخطوطہ ۸۸، مطبع نظامی لکھنوء، ۱۱۴۴ھ، ص ۱۱۱

۱۲۳۔ سفینہ خوشگو، بندرابن داس خوش گو، مرتبہ عطا الرحمان، پٹنہ، ۱۹۵۹ء، ص ۶

۱۲۴۔ ایضاً، ص ۳

۱۲۵۔ نسخہ خطی دیوان ناصر علی، ناصر علی سرہندی، مخطوطہ ۸۸، مطبع نظامی لکھنوء، ۱۱۴۴ھ، ص ۱۷

۱۲۶۔ سفینہ خوشگو، بندرابن داس خوش گو، مرتبہ عطا الرحمان، پٹنہ، ۱۹۵۹ء،

۱۲۷۔ خزانہ عامرہ، غلام علی آزاد بلگرامی، نولکشور پریس کانپور، ۱۸۷۱ء، ص ۴۵۰

۱۲۸۔ ایضاً، ص ۴۵۲

۱۲۹۔ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبدالرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۳۸۲

۱۳۰۔ خزانہ عامرہ، غلام علی آزاد بلگرامی، نولکشور پریس کانپور، ۱۸۷۱ء، ص ۴۵۱

۱۳۱۔ ایضا

۱۳۲۔ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو، ڈاکٹر طارق کفایت اللہ، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ، ۱۹۹۳ء، ص ۲۷۲

۱۳۳۔ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبدالرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۳۸۲

۱۳۴۔ ایضاً

۱۳۵ ایضاً،ص۳۸۳

۱۳۶ ایضاً

۱۳۷ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو،ڈاکٹر طارق کفایت اللہ،پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ،۱۹۹۳ء،ص۲۷۴

۱۳۸ خزانہ عامرہ،غلام علی آزاد بلگرامی،نولکشور پریس کانپور،۱۸۷۱ء،ص۴۵۰

۱۳۹ ایضاً،ص۴۵۲

۱۴۰ ایضاً،ص۴۵۴

۱۴۱ تذکرہ الشعراء پنجاب،خواجہ عبدالرشید،اقبال اکادمی لاہور،۱۹۷۱ء،ص۳۸۵

۱۴۲ ایضاً

۱۴۳ خزانہ عامرہ،غلام علی آزاد بلگرامی،نولکشور پریس کانپور،۱۸۷۱ء،ص۴۵۲

۱۴۴ دیوان گرامی جالندھری،شیخ غلام قادر،مبارک تاجر لاہور،۱۴۴

۱۴۵ ملک الشعراء گرامی جالندھری،محمد ایوب خان،پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ،۲۰۰۴ء،ص۱۴

۱۴۶ چند ہم عصر،مولوی عبدالحق،اردو اکیڈیمی سندھ کراچی،ص۱۵۷

۱۴۷ ملک الشعراء گرامی جالندھری،محمد ایوب خان،پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ،۲۰۰۴ء،ص۱۴

۱۴۸ مخزن شمارہ گرامی،ص۱۵

۱۴۹ ملک الشعراء گرامی جالندھری،محمد ایوب خان،پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ،۲۰۰۴ء،ص۱۸

۱۵۰ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو،ڈاکٹر طارق کفایت اللہ،پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ،۱۹۹۳ء،ص۱۸۷

۱۵۱ ملک الشعراء گرامی جالندھری،محمد ایوب خان،پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ،۲۰۰۴ء،ص۳۲

۱۵۲ رباعیات گرامی،شیخ غلام قادر،شیخ مبارک علی تاجر لمیٹڈ،لاہور،ص۱۷۷

۱۵۳ فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ،ڈاکٹر ریاض وڈاکٹر صدیق شبلی،۲۰۰۴،ص۳۳

۱۵۴ تذکرہ الشعراء پنجاب،خواجہ عبدالرشید،اقبال اکادمی لاہور،۱۹۷۱ء،ص۵۳

۱۵۵ تذکرہ الشعراء پنجاب،خواجہ عبدالرشید،اقبال اکادمی لاہور،۱۹۷۱ء،ص۵۳

۱۵۶ پنجاب کے برگزیدہ غزل گو،ڈاکٹر طارق کفایت اللہ،پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ،۱۹۹۳ء،ص۳۲۰

۱۵۷ اقبال کی شخصیت اور شاعری،حمید احمد خان،بزم اقبال لاہور،۱۹۷۴ء ص۴۵

۱۵۸ مکاتیب اقبال بنام گرامی،محمد عبداللہ قریشی،اقبال اکادمی لاہور،۱۹۷۹ء

۱۵۹ گفتار اقبال،محمد رفیق افضل،ادارہ تحقیقات پاکستان،دانشگاہ پنجاب،۱۹۶۹

۱۶۰ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ،ڈاکٹر عبدالشکور احسن،اقبال اکادمی لاہور،۱۹۸۸ء،ص۱۳

۱۶۱۔ اقبال کا ادبی فن، ص ۶۱

۱۶۲۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۰۰

۱۶۳۔ ایضاً، ص ۲۰۹

۱۶۴۔ تذکرہ الشعراء پنجاب، خواجہ عبدالرشید، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۵۶

۱۶۵۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۰۸

۱۶۶۔ انتخاب ادبیات فارسی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ۱۴۷

۱۶۷۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۵۴

۱۶۸۔ ایضاً، ص ۲۴۷

۱۶۹۔ ارمغان حجاز، ڈاکٹر محمد اقبال، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۲۸ء، ص ۲۳۳

۱۷۰۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۴۴۶

۱۷۱۔ ایضاً

۱۷۲۔ کلیات بیدار، مرتبہ ڈاکٹر محمد جمیل، گریٹ بک کنٹریکٹر، دہلی، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰

۱۷۳۔ ایضاً، ص ۱۵

۱۷۴۔ ایضاً، ص ۵۱۷

۱۷۵۔ ایضاً، ص ۵۱۶

۱۷۶۔ ایضاً، ص ۵۲۶

۱۷۷۔ اضاً، ص ۵۱۵

۱۷۸۔ کلیات بیدار، مرتبہ ڈاکٹر محمد جمیل، گریٹ بک کنٹریکٹر، دہلی، ۲۰۱۸ء، ص ۵۲۳

Punjab Mein Ahem Farsi Rubai Go Shoara:
Ek Tajziati Mutalia

پنجاب میں اہم فارسی رُباعی گوشعراء: ایک تجزیاتی مطالعہ

فیکلٹی آف لینگویجز، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ

میں پیش کیا گیا مقالہ برائے پی ایچ ڈی فارسی

۲۰۲۰

مقالہ نگار

عابد ابراہیم پرہ

نگران

ڈاکٹر زین العباء

اسسٹنٹ پروفیسر نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ

آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز ان اردو، پرشین اینڈ عربک (پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ) مالیر کوٹلہ

شعبۂ فارسی، اُردو اور عربی پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ (پنجاب)

(1) E.G.Browne, A literery History of persian, vol,2.

(2) Pritpal singh, Kalami Goya,English translation studies ,chandigragh.

(3) Sayyed Abdul Wahid, Arts and throught poetry.